جلد پنجم

فیضانِ معرفت

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مرتب

محمد زبیر

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

فیضانِ معرفت

جلد پنجم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

فیضان معرفت جلد پنجم کی

اجمالی فہرست

فہرس

روحانی پرواز

رہ گئی رسم اذاں!

نعمت ومصیبت

کب ملتی ہے؟ کیسے ملتی ہے؟ کیوں ملتی ہے؟

شیخ سے استفادے کا طریقہ

قلوب میں سختی کیوں آتی ہے؟

دلوں کو نرمانے کے نسخے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَۃ

الحمد للّٰه رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى اٰله وأصحابه أجمعين:

محدث کبیر، فقیہ العصر، مولائی ومرشدی حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم العالیہ کے اصلاحی خطابات، جو ہر جمعرات بعد نمازِ مغرب ''مسجدِ بید، محلّہ بیدواڑی بنگلور'' میں ہوتے ہیں، ان خطابات سے بے شمار احباب فیض یاب ہورہے ہیں، ان خطابات کے مجموعے کی چار جلدیں بفضلہٖ تعالیٰ شائع ہوچکی ہیں۔

یہ ''فیضانِ معرفت'' کی پانچویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو بفضلہٖ تعالیٰ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سابقہ جلدوں کی طرح، اسے بھی قبولیت عطا فرمائے اور امت کو فائدہ پہنچائے۔

اللہ والوں کی اصلاحی مجالس، ان کے مواعظ کی اہمیت ونافعیت مسلم ہے، ہر زمانے کے اکابر اِن مواعظ کو پڑھنے کی تاکید کرتے آرہے ہیں، ان کی افادیت کو بیان کرتے آرہے ہیں اور اکابر کی ان ہی صحبتوں اور ملفوظات سے ہزاروں نہیں؛

بل کہ لاکھوں کے دل دل بنے ہیں، بے شمار بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ ملا ہے، بہت سے بے خبر اِن اولیا کے نصائح سے باخبر بنے ہیں؛ بل کہ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دنیا میں جن کو بھی اللہ کی معرفت ومحبت کا کچھ حصہ ملا ہے، وہ ان ہی اہل اللہ کی صحبت اوران سے استفادے کی وجہ سے ملا ہے۔

اصل تو اللہ والوں کی صحبت میں پہنچ کر بہ راہِ راست استفادہ کرنا چاہیے؛ مگر جن کو یہ موقع میسر نہ آسکے، ان کے لیے بالخصوص یہ مواعظ بیش بہا خزانہ ہیں۔

میں مولانا نور اللہ صاحب قاسمی (استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (نائب امام مسجدِ بید) کا اور مولوی سید محمد صہیب، مفتی محمد مدثر (متعلمانِ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) کا ممنون ومشکور ہوں، کہ اِن حضرات نے مجالس کی ترتیب کے سلسلے میں میرا بھرپور تعاون فرمایا، مَیں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِن سب کو اپنے شایانِ شان اجر عطا فرمائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ دعا فرمائیں، اللہ جل شانہٗ اِن مجالس کی ترتیب کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے، امت کو نفع پہنچائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تا دیر قائم ودائم رکھے؛ تاکہ ہم آپ کے علومِ ظاہری وباطنی سے اور آپ کے مواعظِ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر

استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

۱۵/رجب ۱۴۳۸ھ

بہترین انسان کون ہے؟

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی
اور ذکرِ خدا سے دل نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اس سے بڑھ کر
بس دونوں جہاں کی اس نے نعمت پائی

(اکبرالہ آبادی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بہترین انسان کون ہے؟

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : «خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ.»
(جامع الأحاديث :٣٧٦٤٠، كنز العمال:٤٤١٥٤)

(لوگوں میں سب سے زیادہ بہترین انسان وہ ہے، جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔)[1]

محترم حضرات! میں نے اس وقت آپ کے سامنے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت ہی مختصر حدیث پڑھی ہے، جس میں آپ نے لوگوں کو نفع اور بھلائی پہنچانے والے کو سب سے بہترین بتایا ہے، انسان کی خصوصیت اور انسان

---

(۱) مذکورہ الفاظ ایک لمبی حدیث میں حافظ سیوطیؒ نے "جامع الأحاديث" میں اور ان ہی کے حوالے سے علامہ متقیؒ نے "كنز العمال" میں نقل کیے ہیں؛ لیکن اس کی کوئی سند مذکور نہیں ہے اور "كشف الخفاء" میں ہے کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، جس نے یہ ذکر کیا ہو کہ یہ حدیث ہے یا نہیں؛ لہٰذا اس کے بارے میں مراجعت کرنا چاہیے؛ پھر لکھا کہ اس کا معنیٰ صحیح ہے اور احادیث میں اس معنے کے شواہد موجود ہیں، جیسے یہ حدیث کہ «الْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ وَ أَحَبُّهُمْ إِلَى اللّٰهِ أَنْفَعُهُمْ لِعَيَالِهِ» اور حضرت جابرؓ کی حدیث جس کو قضاعیؒ نے روایت کیا ہے، جیسا کہ "جامع الصغير" میں ہے کہ «خير الناس أنفعهم للناس.» (كشف الخفاء:۱/۳۹۳) راقم کہتا ہے کہ اس دوسری حدیث «أنفعهم للناس» کو شیخ البانی نے "سلسلة الصحيحة" میں شواہد کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے۔ (دیکھو! سلسلة الصحيحة:۱/۷۸۷-۷۸۹)

کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ لوگوں کی بھلائی کا کام کرتا رہے۔ ''لوگوں کی بھلائی'' کے اندر بہت ساری چیزیں آجاتی ہیں، جیسے: کسی کو کھانا کھلا دینا، کپڑا پہنا دینا، پانی پلا دینا، راستہ بتا دینا؛ یہ سارے کے سارے نفع کے کام ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان کے نفع کا، بھلائی کا کوئی بھی کام کرتا ہو، وہ انسان سارے انسانوں میں بہتر انسان ہوتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم میں بھلائی کا عنصر زیادہ ہے یا لوگوں کو نقصان پہنچانے کا عنصر زیادہ ہے؟ غور کرتے ہیں، تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچانے کے بہ جائے نقصان پہنچانے کی کوشش زیادہ کرتا ہے۔ دل کو ٹھیس پہنچا دیتا ہے، اس کی عزت پر حملہ کر دیتا ہے، گالم گلوچ کرتا ہے، مالی یا جانی کوئی نقصان پہنچا دیتا ہے؛ اس طرح لوگوں کے درمیان مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ لوگوں کو نقصان زیادہ پہنچاتے ہیں؛ بل کہ زیادہ انسان دنیا میں ایسے ہیں، جو لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، کم انسان وہ ہیں، جو لوگوں کو بھلائی پہنچاتے ہیں۔

اسی لیے اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے توجہ دلائی کہ تم ایک طرف اللہ کی عبادت کرو، اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو صحیح کرو، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرو اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بھلائی پہنچانے کا اور نفع پہنچانے کا کام بھی کرو۔

اس لیے ہمیں اور آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ روزانہ ہم جو کام کرتے ہیں، اس میں کتنے کام ایسے ہیں، جو لوگوں کو نقصان پہنچانے والے ہیں اور کتنے کام ایسے ہیں، جو ہماری طرف سے لوگوں کو بھلائی پہنچانے کے ہوتے ہیں؟! اگر ہر انسان روزانہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرے گا اور حساب لگائے گا، حساب آنے سے پہلے پہلے دنیا ہی میں اپنا جائزہ لینا شروع کر دے گا، تو اندازہ ہو جائے گا، کہ وہ کتنے کام لوگوں کی بھلائی کے کرتا ہے اور کتنے کام لوگوں کو نقصان پہنچانے کے کرتا ہے؟!

مؤمن طعنہ نہیں دیتا

عام طور پر ہماری طرف سے لوگوں کو نفع پہنچنے کے بہ جائے، جو نقصان پہنچتا ہے، تکلیف پہنچتی ہے، وہ تکلیف زیادہ تر زبان کے ذریعے پہنچتی ہے، جس کی وجہ سے ہم بہترین انسان ہونے کے بہ جائے بدترین انسانوں میں شامل ہوجاتے ہیں؛ اس لیے زبان سے تکلیف پہنچانے سے باز آنے کی ضرورت ہے۔

ایک حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلاَ اللَّعَانِ وَلاَ الْفَاحِشِ وَلاَ الْبَذِيِّ.»

(مؤمن طعنہ دینے والا نہیں ہوتا، مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا، مؤمن گالی بکنے والا نہیں ہوتا اور مؤمن کوئی بے ہودہ الفاظ استعمال کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔)

(الترمذي:۱۹۷۷،مسند أحمد:۳۸۳۹،صحيح ابن حبان:۱۹۲،مسند بزار:۱۵۲۳، مسند أبي يعلى:۵۰۸۸)

حدیث کی چار باتیں

اس حدیث میں چار باتیں فرمائی گئی ہیں اور چاروں کا تعلق زبان سے ہے:

ایک تو یہ فرمایا کہ مؤمن طعنہ نہیں دیتا، ''طعنہ'' کے معنے یہ ہیں کہ کسی کی برائی بیان کرنے کے لیے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، بات چیت کے اندر کوئی ایسا لب ولہجہ اختیار کیا جائے، جس سے لوگ سمجھیں کہ یہ اس آدمی کو کہا جارہا ہے۔ یہ ہے ''طعنہ''۔ جیسے: لوگ بات بات میں طعنہ مارتے ہیں، کسی کی برائی کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس سے سننے والا بھی اور دوسرے دیکھنے والے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس آدمی پر طعن کیا گیا ہے۔

یہ بات اسلام میں بہت ہی ناپسندیدہ، بہت ہی زیادہ بری اور بہت ہی زیادہ حقیر ہے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، کہ کوئی مؤمن کسی کو طعنہ مارے۔

طعنہ دینا، جاہلیت کا عنصر ہے

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، جو بہت ہی مشہور صحابی ہیں، ان سے ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی غلطی ہوگئی، اس چھوٹی سی غلطی کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی غلطی قرار دیا اور غلطی ان کی یہ تھی کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، جو بہت مقدس شخصیت ہیں اور بہت ہی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ صحابی ہیں؛ لیکن تھے وہ حبشی اور کالے کلوٹے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ چلتے چلتے ان کو یوں کہہ دیا ''اے کالی کے بیٹے!'' یعنی ان کی ماں کو اُنھوں نے ''کالی'' قرار دیا۔

ہوسکتا ہے ان کی ماں کالی ہی ہوں، جیسے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، وہ بھی کالے تھے؛ کیوں کہ وہ ''حبشہ'' کے رہنے والے تھے اور عام طور پر ''حبشے'' کے رہنے والوں کی صورت وشکل ایسی ہی ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچ گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا:

«إِنَّکَ امْرَءٌ فِیْکَ جَاهِلِیَّةٌ.»

(اے ابوذر! تیرے اندر تو ابھی جاہلیت موجود ہے۔)

(صحیح البخاري:۳۰، مسلم:۴۴۰۳، أبو داود:۵۱۵۹، مسند أحمد:۲۱۴۶۹، مسند بزار:۳۹۹۲، سنن البیهقي:۱۶۱۹۴)

یہ اس لیے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا رواج تھا، کہ وہ اس طرح طعنے کستے

تھے، کسی کے کالے ہونے کو، کسی کے پچھاور ہونے کو، کسی کے چھوٹے ہونے کو، کسی کے اونچے ہونے کو اور کسی کے بدشکل ہونے کو، ان سب کو طعنوں کے لیے استعمال کرتے تھے اور کسی کو کہتے: وہ ٹھگنا ہے، وہ لمبا ہے، وہ چوڑا ہے، وہ موٹا ہے، وہ پیٹ دکھا رہا ہے، وہ ایسا ہے؛ یہ جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، اس کو اسلام ''طعنہ'' کہتا ہے۔

زبان کا زخم، دل کے زخم سے سخت ہوتا ہے

''طعنہ'' کے معنی عربی میں آتے ہیں: ''نیزہ مارنا'' نیزہ وہ آلہ ہے، جس سے آدمی کو قتل کردیتے ہیں یا زخمی کردیتے ہیں۔ مثلاً: اگر کہا جائے ''طَعَنَ زَیْدٌ''، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ زید نے ایک آدمی کو طعنہ لگا دیا یعنی نیزہ ماردیا اور عربی محاورے میں کسی انسان کو برا بھلا کہنے کو اور دل دکھانے کو ''طعنہ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک بڑی حقیقت ہمارے سامنے واشگاف کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جیسے کوئی آدمی کسی کو نیزہ ماردیتا ہے، تو تکلیف ہوتی ہے، آدمی زخمی ہوجاتا ہے، پریشان ہوجاتا ہے؛ اسی طرح زبان کے طعنے بھی انسان کے دل کو زخمی کردیتے ہیں۔ وہ تو جسم کو زخمی کرنے والے اور یہ انسان کے دل کو زخمی کرنے والے ہیں۔

ایک آدمی کسی کے پیٹ میں چھرا گھونپ دے، تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس کو زخم ہوجائے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ زخم بھر بھی جائے اور ٹھیک ٹھاک بھی ہوجائے؛ لیکن عام طور پر جو دلوں کو زخم پہنچایا جاتا ہے، زبان کے ذریعے یہ عام طور پر بھرا نہیں جاسکتا۔

ایک عربی شاعر نے اس مضمون کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے، اس نے کہا ہے:

جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامٌ وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

اس نے بہت بڑی حقیقت بیان کی اور کہا:

''نیزے کے جوزخم انسان کو ہوجاتے ہیں، اس کو تو بھرا جاسکتا ہے، اس کا علاج تو ہوسکتا ہے؛ لیکن جوزخم انسان کی زبان سے کسی کو لگائے جاتے ہیں، اس کو بھرا نہیں جاسکتا''، وہ تو بس دل ٹوٹ گیا، تو ٹوٹ کے رہ گیا؛ حالاں کہ دل کی بڑی اہمیت ہے اسلام میں۔

مومن کا قلب کعبے سے زیادہ عظیم

مؤمن کے قلب کے بارے میں احادیث میں بتایا گیا ہے، کہ مؤمن کا دل کس قدر عظیم ہوتا ہے اللہ کے نزدیک؟ ایک مرتبہ حضرت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طواف کررہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو کعبہ کو دیکھا اور یہ فرمایا کہ ''اے کعبہ! تو کتنا مقدس ہے! تو کس قدر عظیم ہے! تیری عظمت کس قدر ہے! جلالت کس قدر ہے! اللہ نے تجھے کس قدر عظیم وجلیل بنایا ہے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَحُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ حُرْمَةً مِّنْكِ. » (ابن ماجه:٣٩٣٢)

(اس ذات کی قسم، جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے! البتہ مؤمن کی عظمت اللہ کے نزدیک تیری عظمت سے بھی بڑی ہے۔)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبے کی جانب نگاہ کی، تو فرمایا کہ اے کعبہ! تجھے مرحبا ہو، تو کس قدر عظیم ہے! تیری عظمت کا کیا ٹھکانہ! لیکن مؤمن کی عظمت اللہ کے نزدیک تیری

عظمت سے بڑھی ہوئی ہے۔ (شعب الإيمان:۳۷۲۵)

کعبے سے زیادہ عظیم، کعبے سے زیادہ مقدس، کعبے سے زیادہ جلیل، اللہ نے ایک مؤمن کے دل کو بنایا ہے، کعبۃ اللہ کو ڈھا دینا گناہِ عظیم ہے اور مؤمن کے قلب کو تکلیف پہنچانا اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔

حضرت امجد حیدر آبادی نے ایک رباعی کہی ہے، جو اسی مضمون کو ادا کرتی ہے، وہ کہتے ہیں:

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے
رونا تو یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

لیکن آج ہم لوگوں کی طرف سے کیا ہو رہا ہے؟ طعنے کسے جاتے ہیں، عزت و آبرو پر حملہ کیا جاتا ہے، لوگوں کے دلوں کو درد پہنچانے کی سبیلیں تیار کی جاتی ہیں، ان کی غیبتیں کر کر کے ان کو مخدوش کیا جاتا ہے اور گالم گلوچ کرتے ہوئے انسانوں کے دلوں کو توڑا جاتا ہے، اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تو کہتے ہیں کہ مؤمن کے دل کو توڑنا کعبۃ اللہ ڈھانے سے زیادہ سخت بات ہے۔

اسی حدیث کے پیشِ نظر ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ طواف کر رہے تھے، طواف کرتے کرتے کعبے کو خطاب کر کے فرمانے لگے: اے کعبہ! تو بڑا جلیل ہے، بڑا عظیم ہے، تیری بڑائی اور عظمت اللہ نے بہت بلند کی ہے؛ لیکن تیرے سے زیادہ مؤمن کے قلب کو اللہ نے عظیم بنایا ہے۔ (الترمذي:۲۰۳۲)

اس لیے کسی کو طعنہ دینا اسلام کے اندر جائز نہیں ہے اور یہ جاہلیت کا رواج ہے۔

مومن لعنت نہیں کرتا

اور دوسری بات یہ فرمائی کہ «ولا اللَّعَّان»: (مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا) ''لعّان'' کہتے ہیں: لعنت کرنے والے کو، بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے لعنت کے الفاظ بولتے رہنے کی، وہ کہتے ہیں: اللہ تجھے لعنت کرے! اللہ تجھے غارت کرے! اللہ تجھے یوں کرے؛ اور عام طور پر عورتوں کے اندر یہ مزاج زیادہ ہوتا ہے، لعنت کے الفاظ ان کی زبان پر بار بار آتے رہتے ہیں؛ یہاں تک کہ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان کی زبان سے کیا نکل رہا ہے؟ اور یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہماری زبان سے جو نکل رہا ہے، وہ کس کے حق میں نکل رہا ہے؟ یہ بھی خبر نہیں کہ کیا نکل رہا ہے؟ یہ بھی خبر نہیں کہ کس کے بارے میں نکل رہا ہے؟ کبھی کبھی تو اسی بے خبری میں عورتیں خود اپنے بچوں کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتی ہیں کہ ''اللہ تجھے غارت کرے''، ''اللہ تیرے اوپر لعنت کرے'' اور'' تو ایسا ہو جائے اور ایسا ہو جائے''۔ غیروں کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے کرتے نتیجہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے، مزاج کے اندر بے سلامتی یہاں تک داخل ہو جاتی ہے کہ اپنے بچوں کے حق میں بھی یہ الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

لعنت کا وبال خود لعنت کرنے والے پر

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: کوئی آدمی کسی پر لعنت کرتا ہے، تو یہ لعنت اس کے منہ سے نکلنے کے بعد، پہلے تو جاتی ہے آسمانوں کی طرف، اللہ اسے کہتے ہیں: جہاں سے آئی ہے وہاں جا اور جس کے لیے کہی گئی ہے اس کے پاس جا، اگر وہ اس کا مستحق ہے، تو اس پر پڑ جا؛ لیکن اگر وہ اس کا مستحق

نہیں ہے، تو اسی پر پڑ جا، جس نے لعنت کہی ہے۔ اب وہ لعنت آتی ہے، تلاش کرتی ہے کہ کسے لعنت کہی گئی ہے؟ زید کو، عمرو کو، بکر کو، خالد کو، خدیجہ کو، اس کو اور اس کو، جس کے لیے الفاظ استعمال کیے گئے، وہاں جاتی ہے، وہ اگر لعنت کا مستحق ہو؛ تو اس پر پڑتی ہے اور اگر وہ لعنت کا مستحق نہیں؛ تو وہ وہیں سے لوٹ کر اس آدمی کے پاس آتی ہے، جس نے لعنت کہا، پھر اسی پر پڑ جاتی ہے۔

(أبو داود:۴۹۰۵، مسند بزار:۴۰۸۴، شعب الإیمان:۴۷۹۹)

اسی لیے بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں کو کوستا رہتا ہے، دوسروں پر لعنت کرتا ہے، دوسروں کو غارت ہو جانے کی بد دعا کرتا رہتا ہے؛ لیکن خود اس لعنت کا مستحق بن کر خود ہلاکت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کتنے واقعات ہیں دنیا میں کہ آدمی نے کسی اور کے بارے میں لعنت کے الفاظ کہے؛ لیکن خود ہی اس میں گرفتار ہو گیا، دوسروں کو کوستا تھا؛ لیکن خود ہی اس کی زد میں آ کر دنیا ہی سے چلا گیا، مصیبتوں میں پڑ گیا یا اور مختلف قسم کی پریشانیوں میں گھر گیا؛ اس لیے الفاظ کا استعمال بہت ہی سوچ کر سمجھ کر، غور و فکر کے بعد کرنا چاہیے۔

کس پر لعنت کرنا جائز ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ لعنت کس پر کر سکتے ہیں؟ علما نے اس مسئلے کی تفصیل لکھی ہے: اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی صفت پر لعنت کریں، تو جائز ہے، جیسے یوں کہا جائے کہ اللہ جھوٹے پر یا کافر پر لعنت کرے یا جھوٹے پر یا کافر لعنت ہو؛ تو یہ جائز ہے اور اگر کسی معین شخص پر لعنت کی جائے، تو لعنت صرف اُس آدمی پر کر سکتے ہیں، جس کا کفر پر انتقال ہو جانا یقینی طور پر معلوم ہو۔ جیسے: ہمیں معلوم ہے کہ ''ابو جہل'' کافر مرا ہے، ہم کو معلوم ہے کہ ''ابولہب'' کافر مرا ہے؛ دلیل ہے اس

کی قرآن سے حدیث سے، اب کوئی آدمی کہتا ہے کہ ابولہب پر لعنت ہو، یہ درست ہے، وہ کہہ سکتا ہے؛ کیوں کہ وہ لعنت کا مستحق ہے، قرآن کی روشنی میں، حدیث کی روشنی میں دلیل موجود ہے اس کی؛ لیکن موجودہ کسی بھی کافر کو آپ لعنتی نہیں کہہ سکتے؛ کیوں نہیں کہہ سکتے ؟ اس لیے کہ اس کا کفر پر مرنا ہم کو کیا معلوم ہے؟ اب تو وہ کافر ہے؛ مگر ہوسکتا ہے کبھی موت سے پہلے ایمان لے آئے، آپ کی لاعلمی میں کبھی وہ ایمان لے آئے، یہاں تک کہ ہوسکتا ہے مرتے وقت ایمان لے آئے، مرتے مرتے بھی ایمان لا آسکتا ہے آدمی۔ اللہ کسی کو بھی ایمان کی توفیق دے دے، اس میں کیا مضائقہ ہے؟ اس کے اندر اشکال کی کیا بات ہوسکتی ہے؟

اور فاسق مسلمان پر لعنت کے بارے میں بھی علما کہتے ہیں کہ نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ وہ کسی بھی وقت توبہ کرسکتا ہے۔

الغرض جب کافر پر لعنت کرنا جائز نہیں، تو کیا مؤمن پر لعنت کر سکتے ہیں؟ مؤمن تو اللہ پر ایمان سے لبریز ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ تو وہ نیکیاں کرتا رہتا ہے، وہ کچھ نہ بھی کرے، تب بھی تو اس کے دل میں ایمان موجود ہے، اس ایمان کی وجہ سے وہ لعنت کا کبھی مستحق نہیں ہوسکتا؛ اس لیے مؤمن پر لعنت کرنا یہ بہت ہی بدترین قسم کا کام ہے۔

مومن گالی بکنے والا نہیں ہوتا

اس حدیث میں تیسری بات یہ فرمائی کہ «وَلاَ الْفَاحِش» (مؤمن فاحش نہیں ہوتا) ''فاحش'' کے معنے ہوتے ہیں گالی بکنے والا، فحش گفتگو کرنے والا، جیسے: بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے گندے الفاظ استعمال کرنے کی، ماں کی کہہ دی، باپ کی سنادی اور اس کی اور اس کی بک دیا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ!!

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ أَنْ يَلْعَنَ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ.»

(بڑے گناہوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین پر لعنت کرے۔)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: یا رسول اللہ! کیا کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہے؟ ماں باپ کو گالی تو کوئی نہیں دیتا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ ماں باپ کو گالی دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی اور کے ماں باپ کو گالی دو اور وہ پلٹ کر تمھارے ماں باپ کو گالی دے، تو تم نے اس کے ماں باپ کو گالی دے کر اپنے ماں باپ کو جو گالی دلوائی ہے، اس کا باعث اور سبب تو تم خود ہی بنے ہو۔

(البخاري:۵۹۷۳، مسند بزار:۲۴۸۳، ابن حبان:۴۱۱، الأدب المفرد:۲۷)

یہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے کی بات تھی کہ ماں باپ کو کوئی گالی نہیں دیتا تھا؛ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعجب کرتے ہوئے پوچھا کہ اپنے ماں باپ کو گالی کون دیتا ہے؟ لیکن آج کے زمانے میں تو ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتے ہیں۔

ایک واقعہ میرے سامنے آیا: وہ یہ کہ ایک صاحب آئے تھے بوڑھے، وہ کہنے لگے کہ میرا بیٹا داڑھی رکھا ہوا ہے، نماز پڑھتا ہے؛ لیکن مجھے جوتے سے مارتا ہے، یہ کہہ کر باپ زار زار رونے لگا، اسے روتا دیکھ کر ہمیں بھی رونا آ گیا کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ اس زمانے میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی گالی دے گا اپنے ماں باپ کو۔

الغرض حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس حدیث میں بہت ہی اچھے اور انوکھے انداز میں یہ بات سمجھا دی کہ کسی اور کے والدین کو گالی دینا، ظاہر بات ہے کہ یہ گویا اپنے ماں باپ کو گالی دینے کے برابر ہے، مسلمان کو اس کی اجازت نہیں اور مسلمان

کبھی ایسا ہو نہیں سکتا۔

اور صرف والدین ہی کو نہیں، کسی کو بھی مسلمان گالی نہیں دیت، گالی دینے کو حدیث میں منافق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

حدیث میں منافق کی علامات میں کہا گیا ہے:

«إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ.» (البخاري:۳۴،مسلم:۲۱۹)

(منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بولے گا؛ تو جھوٹ بولے گا اور جب وعدہ کرے گا؛ تو اس کی خلاف ورزی کرے گا اور امانت اس کے پاس رکھی جائے؛ تو خیانت کرے گا اور جب جھگڑے گا؛ تو گالی بکے گا۔)

مومن گری ہوئی زبان استعمال نہیں کرتا

اور چوتھی بات حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمائی: «وَ لاَ الْبَذِيّ»: ''بذي'' کہتے ہیں بے حیا کو، بعض علما نے کہا کہ ''بذی'' اس کو کہتے ہیں، جو گالی تو نہیں دیتا؛ لیکن تھرڈ کلاس زبان استعمال کرتا ہے۔ ایک تو اچھے الفاظ ہوتے ہیں اور ایک گھٹیا قسم کے الفاظ ہوتے ہیں۔ گھٹیا زبان نہیں بولتا مسلمان، مسلمان تو اعلیٰ درجے کے الفاظ بولتا ہے، اچھے الفاظ بولتا ہے، پاکیزہ الفاظ بولتا ہے، گھٹیا الفاظ استعمال کرنا، جن کو معاشرے کے درمیان اچھا نہیں سمجھا جاتا، اچھے لوگوں کے درمیان اس قسم کی گفتگو کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، مؤمن کی شان نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرے۔

کتنا پاکیزہ مذہب ہے اسلام، جس کی یہ تعلیمات ہیں کہ مؤمن کسی کو نہ طعنہ دیتا ہے، نہ کسی کو گالی دیتا ہے، نہ کسی کو لعنت کرتا ہے، نہ مؤمن کو کسی کے لیے تھرڈ

کلاس الفاظ بولتا ہے، ان ساری چیزوں سے پاک اس کا معاشرہ ہوتا ہے۔ مؤمن کو اس طرح کی زندگی گذارنے کی ضرورت ہے۔

یہ گفتگو تو زبان سے متعلق ہوگئی، زبان سے ہٹ کر بھی کچھ نقصان پہنچائے جاتے ہیں۔ مثلاً: کسی کا مال دبا لیا، تو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے اور آج کل مال دبا لینا ایک فن بن گیا ہے، لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ بہت بڑا فن ہے، جیسے اور علوم وفنون ہیں، ایسے ہی آج چوری، ڈکیتی، مال کا لوٹ لینا، غصب کر لینا، جھوٹ بول بول کر لوگوں کا مال ہڑپ کر لینا، اس کو بھی ایک فن کاری بنا دیا گیا ہے، اب لوگ اس فن کاری میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں، ایسے ایسے انداز سے دھوکہ دیا جا رہا ہے، جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دھوکہ دینے سے رمضان المبارک میں بھی باز نہ آیا- ایک واقعہ

ایک واقعہ آپ کو بتاؤں جو رمضان المبارک میں پیش آیا، رمضان جیسے مبارک مہینے میں اتنا نامبارک کام! **لاحول ولاقوۃ الاباللّٰہ!**

بنگلور کے ایک محلے: ''جے پی نگر'' کی ایک مسجد: ''مسجدِ رضوان'' کے خطیب وامام مولانا زبیر احمد صاحب میرے پاس آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ ہماری مسجد کے کچھ مصلیوں سے ایک صاحب نے ملاقات کی اور کہا کہ رمضان میں جو لوگ مسجد میں افطار کرتے ہیں، ان کے لیے افطاری کا کچھ فروٹ بھیجنا چاہتا ہوں؛ لیکن میں تنہا ہوں، ایک دو نوجوانوں کو میرے ساتھ بھیج دیجیے؛ تاکہ میں وہاں سے افطاری کا سامان بھجوادوں۔ ان مصلیوں نے کہا کہ ٹھیک ہے اور دو نوجوانوں کو ان کے ساتھ بھیج دیا کہ ان کے ساتھ جاؤ اور یہ جو کچھ دیں؛ لے کے آجانا، وہ شخص ان نوجوانوں کو لے کر کسی فروٹ منڈی میں پہنچا اور جا کر پہلے تو اس نے دکان دار کو فروٹ تولنے کہا،

ستائیس ہزار روپے کا فروٹ اس نے تلوایا، تلوا کر اس نے کہا کہ یہ ایک دوسری مسجد کو لے جانا ہے اور اتنا ہی اور تول دو، اسے یہ دونوں لے جائیں گے، میں اس وقت تک یہ فروٹ دوسری مسجد میں پہنچا کر آتا ہوں اور میں جب تک نہ آؤں ان کو یہیں بٹھا کر رکھو، میں آنے کے بعد جملہ قیمت ادا کروں گا۔

اب وہ ستائیس ہزار کا فروٹ، جو لے کر گیا، تو آیا ہی نہیں، یہ دونو جوان یہیں بیٹھے رہے، یہاں تک کہ افطاری کا وقت ہو گیا، اب وہ دکان دار پریشان کہ بھائی! اتنے روپے کا فروٹ، افطاری کا وقت قریب ہے، کہاں گیا ہے؟ اس کا کوئی فون نمبر ہے، نہ اتا پتا ہے، جو گیا تو آیا ہی نہیں، بہت دیر انتظار کرنے کے بعد فروٹ مرچنٹ نے ان دونو جوانوں سے کہا کہ اس فروٹ کے پیسے آپ ہی دیں گے، انھوں نے کہا کہ ہم کیوں دے دیں، ہم تو مسجد سے صرف اس کے ساتھ اس لیے آئے تھے، کہ وہ روزہ داروں کے لیے افطاری بھیجنا چاہتے تھے، دکان دار نے کہا: نہیں! نہیں، اس نے تو تمھیں بٹھایا ہے؛ اس لیے تمھیں ستائیس ہزار روپے دینا ہوگا؛ ورنہ میں کیس کروں گا، اس کے بعد کمیٹی والوں نے محلے میں چندہ کر کے وہ رقم ادا کی اور مسئلہ حل کیا۔

تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ دھوکہ دیکھو کیسی فن کاری بن گئی ہے؟ جھوٹ ایک فن ہو گیا، دھوکہ ایک فن ہو گیا، لوٹ مار ایک فن ہو گیا، اس انداز میں، رمضان میں، مسجد میں آکر کمیٹی کے افراد کو دھوکہ دینے والے، ذرا اندازہ کر لیجیے کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہوگا؛ اس لیے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے، تو شیطان بھی ذرا ڈھیلا پڑ جاتا ہے؛ بل کہ بند کر دیا جاتا ہے؛ لیکن یہ اس سے بھی زیادہ چست ہو گئے، انھوں نے کہا: شیطان ذرا ڈھیلا بیٹھا ہے، ہم اس کا فریضہ انجام دیں گے، یہ اس

سے بھی آگے بڑھ گئے۔

دیکھیے ! اللہ کے نبی تو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان دوسروں کو نفع پہنچا کر بہترین انسان بن جائے؛ مگر مسلمان دوسروں کو دھوکہ دے کر، نقصان پہنچا کر بدترین انسان بن رہا ہے۔

سفیر کو دھوکہ دینے والے حقیر کا واقعہ

ایک اور واقعہ رمضان المبارک ہی میں دو تین سال پہلے پیش آیا تھا، وہ یہ کہ مدارس سے سفیر حضرات چندہ وصول کرنے کے لیے آتے ہیں، تو ایک سفیر صاحب کہیں جا رہے تھے، ایک صاحب اسکوٹر میں آ کر ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور پوچھا: حضرت! کہاں جانا ہے؟ انھوں نے کہا: بس اسٹینڈ جانا ہے، وہاں سے فلاں جگہ جانا ہے، انھوں نے کہا کہ میری اسکوٹر پر بیٹھ جائیے، مجھے بھی چندہ دینا ہے، یہاں قریب میں میرا گھر ہے، وہاں آپ کو چندہ بھی دے دیتا ہوں اور بس اسٹینڈ تک آپ کو ڈراپ (Drop) بھی دے دوں گا۔ سفیر صاحب کو اس کی بات پر یقین آ گیا اور وہ اس کے ساتھ اسکوٹر پر سوار ہو گئے، جب چلے تو ان صاحب نے سفیر صاحب سے کہا کہ آپ اپنا بیگ یہاں اسکوٹر کے سامنے رکھ دیجیے اور خود آرام سے بیٹھ جائیے، ان کی بیگ لے کر سامنے بیگ لگا لی اور ایک جگہ گئے، وہاں گاڑی روک کر کہنے لگے کہ اتر جائیے، سفیر یہ سمجھ کر اتر گئے کہ ان کا گھر آ گیا ہے؛ لہٰذا وہ اتر کر کھڑے ہوئے، تو وہ اسکوٹر لے کر آگے بڑھ گئے، سفیر صاحب انتظار میں ہیں کہ اب آئیں گے، تب آئیں گے؛ لیکن نہ بیگ آئی، نہ اسکوٹر والا آیا، اس بیگ میں کچھ رقم، رسید بک وغیرہ تھیں۔

یہ صورتِ حال ہے، اس قدر لوگوں میں جھوٹ، دھوکہ دہی، فریب اور مکاریاں

اورعیاریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اللہ حفاظت فرمائے! رمضانِ مبارک تک کا احترام دلوں سے ختم ہوگیا ہے۔

بہ ہرحال یہ میں نے عرض کیا کہ نقصان پہنچانے کی جو شکلیں ہیں، ان میں ایک تو زبان سے نقصان پہنچانا ہے اور دوسرے مال کے ذریعے یا ان کی جائداد پر حملہ کرکے نقصان پہنچانا ہے، اسی طرح جسمانی طور پر کسی کو نقصان پہنچادے، مار پیٹ دے، قتل کردے، غارت گری پر اتر آئے؛ یہ ساری شکلیں ہیں، ہزاروں شکلیں ہیں۔ آپ سوچ کر دیکھ لیجیے کہ ہم کوئی نہ کوئی شکل اختیار کرکے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے کام میں مبتلا ہیں۔ کوئی بڑا نقصان کررہا ہے، کوئی چھوٹے چھوٹے نقصان پہنچارہا ہے، کوئی زبان سے تکلیف پہنچارہا ہے، کوئی ہاتھ پیر سے تکلیف پہنچا رہا ہے، کوئی مالی نقصان پہنچارہا ہے، کوئی جانی نقصان پہنچارہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح تکلیف پہنچانے والا، بہترین انسان کیسے ہوگا؟ وہ تو بدتر سے آگے بدترین ہوگا۔

حجۃ الوداع کی تقریر میں مومن کی جان و مال کی حرمت کا بیان

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر حضراتِ صحابہ سے پوچھا کہ «أي يوم هذا؟» (یہ کونسا دن ہے؟) صحابہ خاموش ہوگئے اور انھوں نے یہ سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ ''یوم النحر'' یعنی قربانی کا دن نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں! آپ نے پھر پوچھا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ صحابہ خاموش رہے، تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ یہ ''ذی الحجہ'' کا مہینہ نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ یہ کونسا شہر ہے؟ صحابہ خاموش رہے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا ''بلدِ حرام:

مکہ" نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ « فَإِنَّ دِمَائَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَ أَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا. » (بلا شبہ تمھاری جانیں اور تمھارے مال اور عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں، جس طرح آج کے اس دن کی حرمت اس ماہ اور اس شہر میں ہے۔) (البخاري:٧٠٧٩، مسلم:٤٤٧٨)

غور کریں اس حدیث میں کہ اللہ کے نبی نے مومن کے مقام اور اس کے احترام اور اس کی عزت کو ایسے ہی لازم قرار دیا، جیسے کہ ہم عرفے کے دن کو، ذی الحجہ کے ماہ کو محترم و مقدس سمجھتے ہیں؛ لہٰذا مومن کو نہ جانی نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ مالی طور پر کوئی نقصان پہنچانے کی اجازت ہے، نہ عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی اجازت ہے۔

بھائیو! یہ ایک پہلو تھا ہمارے زندگیوں کا، جس میں ہم دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، میں نے اس لیے عرض کر دیا کہ ہمارا ذہن چلنے لگے کہ ہم لوگوں کو جانی طور پر، مالی طور پر، ان کی عزت و آبرو پر حملہ کر کے یا زبان کے ذریعے سے کسی نہ کسی نہج پر، ان کو جو نقصان پہنچاتے ہیں؛ یہ سارے کے سارے حرام و ناجائز کام ہیں، ہمیں اس سے توبہ کرنا چاہیے۔

الغرض اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ. » بہترین انسان وہ ہے، جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ نفع کیسے پہنچایا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے کیا شکلیں ہو سکتی ہیں؟ سوچنے سے آپ کو بھی بہت ساری شکلیں سمجھ میں آئیں گی۔

غریبوں کی امداد کے ذریعے نفع پہنچائیں

جب ہم قرآن و حدیث میں غور کرتے ہیں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

سیرت میں غور کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت ساری شکلیں لوگوں کو نفع پہنچانے کی بیان کی گئی ہیں:

غریبوں کی امداد کی ایک شکل ان کو کھانا کھلا دینا ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کا بہت کثرت کے ساتھ ذکر آیا ہے کہ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ "**طعام المسکین**" کے لفظ سے اللہ نے جگہ جگہ اس کا قرآن میں ذکر فرمایا ہے؛ یہاں تک کہ ایک جگہ قرآنِ کریم یہ بھی کہتا ہے کہ جہنم میں جانے والے لوگوں سے کچھ لوگ پوچھیں گے کہ ارے تم جہنم میں کیوں چلے گئے؟ ﴿**مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ**﴾ اس کے جواب میں جو بات جہنمی کہیں گے، اس میں ایک جملہ یہ بھی آیا ہے: ﴿**وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ**﴾ جہاں ہماری بہت ساری خرابیاں تھیں، ہمارے اندر بہت سارے گناہوں کی بات تھی، وہیں ہمارے اندر یہ بات بھی تھی کہ ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کی امداد کی یہ شکل کہ کھانا کھلایا جائے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت محبوب شکل ہے۔ جہنم سے بچنے کا ذریعہ ہے، جنت میں داخلے کا سبب ہے۔

کھانا کھلانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی کو کھانا پکوا کر کھلا دیا جائے، ایک یہ ہے کہ کسی کو پیسہ دے دے، وہ اپنا کھانا خود ہی لے کر کھالے، یہ بھی ٹھیک ہے اور ایک اعتبار سے یہ افضل ہے اور یہ بھی ﴿**نطعم المسکین**﴾ کے اندر داخل ہے، یا یہ کہ اناج اور غلہ دے دیا جائے، اس طرح لوگوں کے کھانا کھلانے کا بندوبست کر دیا جائے، یہ اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے اور اللہ کے نزدیک یہ عمل پسندیدہ اس لیے ہے کہ دراصل کھانا انسان کی ضروریات میں سے بنیادی ضرورت ہے اور اسی بنیادی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسلام میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ غریبوں کو زکاۃ ادا کرو؛ مگر یہاں ایک بات کا دھیان ہونا چاہیے کہ زکاۃ صرف ان کو دینا

چاہیے، جن کو زکاۃ دینے کی اجازت ہے اور جن کو زکاۃ دینا جائز نہیں، ان کو اگر زکاۃ دیں گے؛ تو یہ درست نہ ہوگا۔

اعلیٰ عصری تعلیم کے لیے زکاۃ دینے کا حکم

مگر یہاں ایک بات کی طرف توجہ دینا ضروری ہے: وہ یہ کہ آج کل بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہائی ایجوکیشن کے لیے، اعلیٰ تعلیم کے لیے اور گریجویشن کے لیے زکاۃ کی رقوم کا استعمال جائز ہے اور جو لوگ آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں ان کو یہ زکاۃ کی رقم دی جاتی ہے اور اس سے ڈاکٹر اور انجینئر بنائے جاتے ہیں؛ لیکن یہاں پر دو نکتے بہت ہی قابل غور ہیں:

(۱) ایک تو وہی جس کی طرف میں نے ابھی شارہ کیا کہ زکاۃ کو جو فرض کیا گیا ہے، اس کا مقصد غریبوں کی غربت کو دور کرنا ہے، ان کے کھانے کا ان کے پینے کا، ان کی بنیادی ضرورتوں کا انتظام کرنا مقصود ہے۔ بہت سارے لوگ غربت زدہ ہوتے ہیں، بیمار ہوتے ہیں Handicapped ہوتے ہیں، جو کما نہیں سکتے اور معذور لوگ، جن میں سے کسی کا ہاتھ کٹا ہوا ہے، کسی کا پیر کٹا ہوا ہے یا کوئی آنکھوں کا معذور ہے، یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا، زکاۃ کے ذریعے ان کی امداد کی جائے اور ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے، اس کے لیے زکاۃ فرض کی گئی ہے۔ اب ایک آدمی جس کے پاس روپیہ ہے، پیسہ کھانے کے لیے ہے، پینے کے لیے ہے، گھومنے کے لیے اعلیٰ سواری بھی اس کے پاس موجود ہے، بنگلہ بھی اس کے پاس موجود ہے، گھر بھی اس کے پاس موجود ہے؛ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈونیشن دینے کے لیے ایک لاکھ روپیے، دو لاکھ روپیے اس کے پاس اس وقت موجود نہیں، یاد رکھیں کہ ایسا آدمی کو زکاۃ دینا جائز نہیں؛ اس لیے کہ اعلیٰ ڈگریاں اس کی

بنیادی ضرورت نہیں ہیں۔

(۲) دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ زکاۃ دینے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مستحق بھی ہے یا نہیں، اگر وہ مستحق نہیں ہوگا؛ تو زکاۃ ہی ادا نہیں ہوگی۔

الغرض زکاۃ کا جو سسٹم قائم کیا ہے، اس سے مقصود کیا ہے؟ یہ ہمارے ذہنوں میں ہونا چاہیے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھائی! صرف غریبوں کو زکاۃ دی جائے گی، تو ایسے لوگ تو عمر بھر زکاۃ لیتے ہی رہتے ہیں؛ اس لیے ہم دو چار آدمیوں کو زکاۃ کی رقم دے کر کچھ ڈاکٹر، انجینئر، لائر، پروفیسر بنا دینا چاہتے ہیں؛ تاکہ یہ لوگ اس رقم سے کچھ بن جائیں؛ مگر ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ اللہ نے جب آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ غریب لوگوں کو دیتے رہیں، تو اگر کوئی غریب ہے، تو اس کو دیتے رہنا چاہیے، اللہ نے جب ان کو غریب بنایا ہے، ضرورت مند بنایا ہے اور ہمیشہ کا مستحق بنایا ہے، تو ان کو دیتے رہنا ہے، یہ کہنا کہ کب تک ان کو دیتے رہیں گے؟ فضول بات ہے۔

بہ ہر حال اللہ تعالیٰ کے نزدیک امداد کی اور نفع پہنچانے کی، لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی، ایک اعلیٰ درجے کی قسم اور شکل یہ ہے کہ غریبوں کو کھانا کھلاؤ، یا ان کو کھانے کا پیسہ دے دو اور ان کی بنیادی ضرورتوں میں لگاؤ اور اس طرح سے ان کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو۔

قسم کے کفارے میں غریبوں کو کھلانے کا حکم

غریبوں کی امداد کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ان کی بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھنا کس قدر اہم ہے؟ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے ان کے فائدہ کے لیے مال داروں کو زکاۃ نکالنے کا حکم دیا،

دوسری طرف کچھ ایسے امور ہیں کہ آدمی اگر ان کا ارتکاب کر لے، تو اللہ نے اس کے تدارک کے لیے بھی غریبوں کو کھانا کھلانے اور کپڑا پہنانے کا حکم دیا ہے۔

مثال کے طور پر ایک آدمی نے قسم کھالی کہ اللہ کی قسم! میں فلاں کام نہیں کروں گا، اس کے بعد اس قسم کو توڑ دیا، جو کام نہیں کرنے کا تھا، جس کی قسم کھائی تھی، وہ کام وہ کر بیٹھا، اب اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ تم میرے لیے دس رکعت نماز پڑھ لو، اللہ نے یہ نہیں کہا کہ تم قرآن کی تلاوت کرلو، تم ذکر کرلو؛ بل کہ یہ کہا ہے کہ غریبوں کی امداد اس طریقے پر کرو کہ دس مسکینوں کو درمیانی قسم کا کھانا کھلاؤ یا دس آدمیوں کو کپڑا پہنادو یا غلام آزاد کرو۔ (المائدۃ: ۸۹)

اب دیکھو! اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارے میں غریبوں کی امداد کا ذکر فرمایا ہے، کپڑا پہنانا بھی بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح کھانا کھلانا بھی بنیادی ضرورت ہے، ہاں! کوئی آدمی ایسا ہے کہ وہ کپڑا نہیں پہنا سکتا، یا اس کے پاس اتنی وسعت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کھانا کھلا سکے، تو تین دن روزہ رکھ لینے کی بھی اس کو اجازت دی گئی ہے؛ لیکن پہلے مرحلے میں یہ ہے کہ غریبوں کی امداد کرو؛ حالاں کہ آدمی نے تو قسم توڑ کر اللہ کے حق کو ضائع کیا تھا، اللہ تعالیٰ کے حق کو ضائع کرنے پر اللہ نے اس کا جو تدارک تجویز کیا ہے، وہ یہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرو، اگر تم نے غریبوں کی مدد کردی، تو میرا حق، جو تم نے توڑ دیا تھا؛ میں اس حق کی تلافی کر دوں گا۔

بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھیے! حق توڑا جا رہا ہے اللہ کا، حق ضائع کیا جا رہا ہے اللہ کا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میرا حق تم نے ضائع کیا ہے، تو اس کا تدارک یہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرو، ان کو کھانا کھلا دو، یا کپڑا پہنا دو۔ اس سے عند اللہ غریبوں کی امداد کا درجہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رضا غریبوں کی امداد میں ہے۔

کفارۂ ظہار میں بھی غریبوں کو کھلانے کا حکم

اسی طریقے سے ایک مسئلہ ہے، جس کا نام ہے ''ظہار''، یہ ہمارے یہاں تو رائج نہیں ہے، عربوں میں اس کا دستور تھا اور شریعت نے اس کا مسئلہ بتایا ہے کہ ظہار کیا ہے؟ ''ظہار'' کہتے ہیں اس کو کہ ایک آدمی اپنی بیوی سے کہہ دے کہ ''تو میرے لیے ایسی ہے، جیسی میری ماں کی پیٹھ'' عربی میں اس کو اس طرح کہتے ہیں: ''أنتِ عليَّ كظهر أمي.'' یہ عربی کے الفاظ ہیں، زمانۂ جاہلیت میں بھی استعمال ہوتے تھے اور جب اسلام آ گیا، تو اسلام میں بھی لوگ اس کو استعمال کرتے تھے۔

اس طرح کہہ دینے کا نام ''ظہار'' ہے، اس کا حکم کیا ہے؟ قرآنِ کریم میں ایک جگہ اس کا ذکر آیا ہے: اس کا واقعہ یہ آیا ہے کہ ایک صحابیہ خاتون: حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر نے کہہ دیا تھا کہ '' أنتِ عليَّ كظهر أمي'' (تو میرے لیے ایسی ہے، جیسے کہ میری ماں کی پیٹھ) یعنی جیسے میری ماں کی پیٹھ میرے لیے حرام ہے، میری ماں میرے لیے حرام ہے، اسی طرح تو بھی میرے لیے حرام ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ اس جملے کو ''طلاق'' کے معنے میں لیتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ کہہ دیتا؛ تو زمانۂ جاہلیت کے لوگ کہتے تھے کہ طلاق پڑ گئی۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور کہا کہ یا رسول اللہ! میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ میرے شوہر نے مجھ سے کہہ دیا کہ ''أنتِ عليَّ كظهر أمي'' آپ بتائیے کہ اس کا مسئلہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شریعت کا اس وقت تک کوئی حکم اس بارے میں نازل نہیں ہوا تھا، حکم نازل ہونے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا، تو حضرت خولہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کرنے لگیں، انھوں نے کہا کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کے اس طرح کہہ

دینے سے طلاق پڑ جائے؟

اس وقت اللہ نے اس کے بارے میں قرآن میں آیات نازل فرمائی ہیں اور عجیب انداز کی آیات نازل فرمائی ہیں:

﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴾ (المجادلۃ :۱)

(اللہ نے اس عورت کی گفتگو کو سن لی، جو عورت اے نبی! آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کر رہی تھی، اللہ تو بہت سننے والے ہیں، سب سے زیادہ دیکھنے والے ہیں۔)

پھر اس کے بعد اس مسئلۂ ظہار کا حکم نازل فرمایا کہ اگر کوئی مرد اپنی عورت سے یہ کہہ دیتا ہے کہ ''تو میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے''، تو اس کی بیوی حقیقت میں ماں نہیں ہو جاتی، کیسے ماں ہو جائے گی؟ ماں نہیں ہوگی، جیسے کوئی آدمی کسی کو کہہ دے ''تو میرا بیٹا ہے''؛ تو وہ بیٹا نہیں ہو جاتا۔

اسی طرح اگر کسی نے اپنی بیوی کو یوں کہہ دیا کہ تو میری ماں کی طرح ہے، تو وہ ماں نہیں ہو جاتی؛ لیکن کہنے والے کے اوپر کفارہ واجب ہو جاتا ہے کہ تم نے ایک غلط بات کیوں کہی اپنی زبان سے؟ اس غلط بات پر تمھاری یوں پکڑ ہے کہ تمھارے اوپر ایک کفارہ واجب ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، غریبوں کی امداد کرو، اگر تم نے یہ کیا تب تم بیوی سے مل سکتے ہو؛ اگر تم نے ساٹھ مسکینوں کو کھانا نہیں کھلایا، تو بیوی کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کو کہتے ہیں ''مسئلہ ظہار''۔

تو بھائیو! بزرگو! میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کی رحمت غریبوں پر دیکھیے

اور کس طرح اللہ ان کا نظام کررہا ہے اس کو دیکھیے۔ شریعت میں غریبوں کا کتنا خیال رکھا گیا ہے اس کو دیکھیے؟

مخلوق کو نفع پہنچانے کی ایک شکل آپ کے سامنے عرض کی کہ غریبوں کی امداد کرنا ہے، اس کے علاوہ بھی غور کریں گے، تو بے شمار شکلیں ہوسکتی ہیں۔

الغرض خلاصہ یہ ہے کہ ہم مخلوق کو نفع پہنچا کر بہترین انسان بننے کی فکر کریں، تکلیف پہنچا کر بدترین انسان نہ بنیں۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی مرضیات پر چلائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

روحانی پرواز

جب میں نے طبیب سے کہا دردِ نہاں
بولا کہ ہے یادِ دوست اس کا درماں
پوچھا جو غذا ، کہا یہی خونِ جگر
پرہیز یہ ہے کہ ترک کردے دو جہاں

(امجد حیدر آبادی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روحانی پرواز

الحمد لله و كفىٰ وسلام علىٰ عباده الذين الصطفىٰ ، أما بعد:

حضرات! یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو چیزوں سے مرکب کر کے بنایا ہے: ایک چیز نیچے کی، یعنی زمین کی مٹی سے انسان کا جسم تیار کیا ہے اور دوسری چیز روح ہے، جو اوپر آسمانوں سے آئی ہے۔ جیسے قرآن کریم کہتا ہے:

﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي﴾ (ص: ۷۲)

(میں نے اپنی طرف سے اس کے اندر روح ڈالی۔)

انسان ان دو چیزوں روح اور جسم کا مرکب ہے، جب دو چیزوں کا یہ مرکب ہے، تو ان دو چیزوں کے تقاضے بھی اللہ نے اس کے اندر پیدا کر دیے اور یہ انسان کے ساتھ بڑی عجیب وغریب اللہ تعالیٰ کی آزمائش وامتحان کا معاملہ ہے؛ یعنی اس کے اندر دو قسم کی متضاد چیزوں کو جمع فرما کر اور متضاد قسم کے اوصاف اور متضاد قسم کے تقاضوں کو رکھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کو ایک آزمائش سے گذار رہے ہیں۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بنایا، تو ان کے اندر دو قسم کی چیزیں نہیں ہیں، وہ تو بس ایک ہی قسم کی چیز سے بنے ہیں؛ اس لیے ان کے یہاں متضاد تقاضے بھی نہیں، بس ان کے پاس ایک ہی ایک تقاضا ہے اور وہ اللہ کی عبادت و

اطاعت کا تقاضا ہے اور اسی کا جذبہ ان میں ابھرتا ہے اور وہ اسی پر چلتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسی کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

﴿لا یَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ (التحریم: ٦)

(جو اللہ حکم دیتا ہے، اس کے مطابق چلتے ہیں اور اللہ کی کسی بھی معاملے میں نافرمانی نہیں کرتے۔)

فرشتوں میں ترقی کا سلسلہ کیوں نہیں؟

الغرض فرشتوں کے یہاں تقاضا ایک اور اسی پر ان کی زندگی ہو رہی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں ترقی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا؛ اس لیے کہ اللہ نے جس انداز سے ان کو پیدا فرما دیا اور ایک تقاضا ان کے ساتھ لگا دیا کہ کسی فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے رکوع میں لگا رکھا ہے، کسی کو سجدے میں لگا رکھا ہے، کسی کو قیام میں لگا رکھا ہے اور کسی کو کسی کام میں، کسی کو کسی اور کام میں لگا رکھا ہے اور وہ فرشتے بس وہی کام ہمیشہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔

بعض فرشتوں کو اللہ نے بنایا اور ان کو ایک کام دے دیا، جیسے حضرت اسرافیل علیہ السلام، کہ ان کو صور پھونکنا ہے قیامت کے دن، جب سے وہ پیدا ہوئے، تب سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے منھ میں صور دے رکھی ہے اور وہ اللہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں؛ یعنی اللہ کے عرش کی طرف اور اس حکم کے انتظار میں ہیں کہ کب اللہ مجھے حکم دے گا کہ صور پھونکوں اور میں پھونک دوں؟ اس فرشتے کا اور کوئی کام نہیں، اللہ نے صرف ایک کام کے لیے اس کو پیدا کیا اور جب سے پیدا کیا، تب سے قیامت تک اسی کام میں لگا ہوا ہے۔

الغرض اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کو بنایا اور ایک چیز سے بنایا، ایک ہی قسم کا

تقاضا ان میں رکھا؛ اسی لیے ان کے یہاں کوئی ترقی والا معاملہ بھی نہیں ہے، جس کام کے لیے پیدا کر دیا اور جس کام پہ ان کو لگا دیا، بس اسی کام پر وہ لگے ہوئے ہیں قیامت تک۔

''عقیدۂ حلول'' باطل ہے

فرشتوں کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو متضاد قسم کی چیزوں کا مرکب بنایا ہے: ایک جسم، دوسرے روح؛ جسم مٹی کا اور روح آسمانوں کی۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي﴾ (ص: ۷۲)

(میں نے اپنی طرف سے روح انسان میں ڈالی ہے۔)

اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی طرف سے، اپنی قدرت سے روح انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کے اندر ڈالی ہے؛ کیوں کہ اللہ ہر چیز پیدا کرنے والا ہے، روحوں کو بنانے والا بھی وہی ہے، اس اللہ نے روح انسان کے اندر ڈالی، یہ مطلب ہے اس آیت کا۔

یہاں جو ''مِنْ'' آیا ہے، اس کے معنے ہیں ''اللہ کی طرف سے''، یہ ''من'' تبعیضیہ نہیں ہے، یہ ابتدائیہ ہے۔ عربی جاننے والے اس کو سمجھ سکتے ہیں، اس ''من'' کو تبعیضیہ مانیں؛ تو پھر معنی غلط ہو جائے گا اور معنی اس کا یہ ہوگا کہ ''میری روح میں نے اس کے اندر پھونک دی''، یہ حلول والا عقیدہ بعض لوگوں نے یہیں سے پیدا کیا ہے، بعض جاہل واناڑی صوفیا نے، جن کو قرآن وحدیث کا صحیح درک نہیں تھا، قرآن وحدیث کی صحیح فہم وبصیرت نہیں تھی، انھوں نے اس کا یہ معنیٰ سمجھ لیا کہ اللہ نے اپنی روح انسان میں ڈال دی ہے؛ اس لیے انسان کیا ہے؟ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ

کا ''اَوتار'' ہے (نعوذ باللہ!) یہ سمجھ گئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اندر حلول کر گئے، یہ حلول والا عقیدہ یعنی اللہ تعالیٰ انسان میں اتر گیا ہے، اللہ انسان کے اندر آ گیا ہے، یہ عقیدہ بعض جاہل قسم کے لوگوں نے گھڑ لیا تھا، تمام کے تمام علمائے اسلام کے نزدیک یہ عقیدہ باطل اور کافرانہ عقیدہ ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دو متضاد قسم کی چیزوں سے بنایا

الغرض انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو متضاد قسم کی چیزوں سے بنایا: ایک مٹی نیچے والی اور ایک روح، وہ اوپر والی؛ ظاہر ہے کہ اوپر والی اور نیچے والی چیزوں کے تقاضوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، جب ان کو مرکب کیا، دونوں قسم کے تقاضے انسان کے اندر پیدا ہو گئے: چناں چہ مٹی کے تقاضے اس میں پیدا ہوتے ہیں اور انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور روح کے تقاضے بھی اس کے اندر ہیں، وہ انسان کو ایک دوسری طرف کو کھینچتے ہیں، اسی کھینچا تانی میں اور اسی آگے پیچھے ہونے سے انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ ترقی عطا فرماتے ہیں۔

مٹی جو انسان کی اصل ہے، اس کا جسم جس سے بنایا گیا ہے، اس کے تقاضے اس کو گھٹیا گھٹیا کام کرنے پر ابھارتے ہیں، بے کار اور فضول قسم کی چیزوں میں اس کو لگانے کی کوشش کرتے ہیں؛ گناہوں میں لگا دیتے ہیں، یہ مٹی کے تقاضے ہیں، اگر مٹی کے تقاضوں پر انسان عمل کرنا شروع کر دے گا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذلیل ہوگا، خوار ہوگا، پستیوں میں اور ذلتوں میں مبتلا کر دیا جائے گا اور آسمانی فیصلہ بھی اس کے حق میں یہ ہوگا کہ یہ ذلیل ہے، یہ خوار ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ (البقرۃ: ٦١) یہ دیکھو! یہودیوں کے بارے میں اللہ نے کہا کہ ان کے اوپر ذلت ومسکنت کا ٹھپا لگا دیا گیا، ان کے اوپر مہر لگا دی گئی کہ یہ ذلیل ہیں، یہ خوار ہیں، یہ

اوپر کی طرف کبھی نہیں اُڑ سکتے، یہ بلندیوں کی بات سوچ نہیں سکتے، یہ جو کام بھی کریں گے؛ گھٹیا کریں گے، ذلت ورسوائی والا کریں گے، تھرڈ کلاس اور بدترین قسم کا کریں گے۔

کیوں؟ مٹی کے تقاضوں پر عمل ہو رہا ہے، بس جناب مٹی کا تقاضہ ہے کھاؤ! کھاؤ! کھاؤ! اور پیو اور نفسانی خواہشات کو پورا کرو، انسان کھانے میں لگ گیا اور جب کھانے کا تقاضا پیدا ہوا، تو یہ بھی اس کو یاد نہیں رہا کہ اچھا کھاؤں، یا بُرا کھاؤں؟ حلال کھاؤں یا حرام کھاؤں؟ ایسے ہی اپنی خواہشات میں وہ اندھا ہو گیا اور حلال وحرام کی تمیز کو کھو کر اس کو پورا کرنے میں لگ گیا، مٹی کے تقاضے پر لگ گیا اور اسی مٹی کے تقاضے نے اس کو ذلت اور رسوائی میں مبتلا کر دیا۔

یہ نیچے والا عالم ہے، جس میں ہم اور آپ جی رہے ہیں، کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، اس کا نام ہے ''عالمِ ناسوت''؛ ''ناسوت'' کا لفظ، لفظِ ''ناس'' سے بنایا گیا ہے اور ''ناس'' کے معنے انسان، تو اگر انسان خود کو اس نیچے والے عالم کے تقاضوں میں لگائے گا، تو وہ نیچے ہی رہے گا، کبھی اس کو ترقی اور پرواز نصیب نہ ہوگی۔

دوسری جانب اس میں روح کا تقاضا بھی ہے، روح اوپر کے عالم کی چیز ہے؛ لہٰذا وہ انسان کو اوپر کی جانب لے جانے کی کوشش کرتی ہے اور ''عالمِ ملکوت'' کی سیر کرانا چاہتی ہے، یہ ''عالمِ ملکوت'' فرشتوں والا عالم ہے اور فرشتے کھاتے نہیں ہیں، پیتے نہیں ہیں اور اُنھیں بیوی بچوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو بس اللہ کی یاد میں زندگی گذارتے ہیں، رکوع ہے، سجدہ ہے، ذکر ہے، تلاوت ہے اور عبادتیں ہیں اور ریاضتیں ہیں اور اسی طریقے پر اللہ کو خوش کرنے والے کام وہ برابر کرتے رہتے ہیں، جو اللہ کا حکم ہوا؛ اس کو پورا کرنے میں برابر لگے ہوئے ہیں، یہ ہے ''عالمِ ملکوت''۔

انسان اپنے اندر اگر ملکوتی صفات کو غالب کرے گا، اللہ کی یاد میں زندگی کرے

گا، اللہ کی محبت میں زندگی کرے گا، اللہ کے عشق میں زندگی بسر کرے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق اور اللہ سے انسیت اپنے اندر پیدا کر لے گا اور اللہ کے احکام پر پورے پورے طور پر چلنا شروع کر دے گا؛ تو یہ ملکوتی صفات کا حامل ہو جائے گا، روحانی اعتبار سے ترقی کرے گا؛ لیکن اس کے لیے اس کو ذرا سی محنت برداشت کرنی پڑے گی، جب ذرا سی محنت کرے گا؛ وہ عالمِ ارواح سے اپنے تعلق کو جوڑ سکے گا اور پھر اس کو پرواز نصیب ہوگی، کونسی پرواز؟ روحانی پرواز؛ لیکن عام طور پر انسان جس عالم میں ہے، وہ عالمِ ناسوت ہے اور مٹی اس کے قریب ہے، یہ عالم اسے نظر بھی آتا ہے، عالمِ ارواح بہت دور ہے اور وہ اس کو نظر بھی نہیں آتا: اس بنا پر انسان عام طور پر اسی عالم ناسوت کی جانب ڈھلک جاتا ہے، بار بار جسم کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جسمانیات کی طرف توجہ کرتا ہے، کھانے اور پینے میں لگا رہتا ہے، اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں منہمک رہتا ہے اور دکان، بازار، گھر اور دنیا کی مختلف قسم کی چیزوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر وہ روح کے تقاضے کے مطابق خود کو عالمِ ملکوت کی جانب متوجہ کر دے اور اس کے لیے وہی سارے اعمال اختیار کرے، جو ملائکہ کے اعمال ہیں؛ تو اس کی روحانی پرواز بھی بالیقین نا قابلِ تسخیر ہوگی۔

روحانی پرواز کی مثال

ایک دفعہ ہمارے شیخ ومرشد حضرت اقدس مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ حیدرآباد تشریف لا رہے تھے، مجھے اطلاع ہوئی، تو میں بھی یہاں سے حضرت کو ملنے کے لیے گیا، ائیر پورٹ پر ہم لوگ پہنچ گئے، حیدرآباد کے بھی بہت سارے احباب و متعلقین وہاں حضرت والا کے استقبال کے لیے اور آپ کو رسیو

(Recive) کرنے کے لیے موجود تھے، کچھ دیر بعد حضرت والا ائیر پورٹ کے اندر سے باہر تشریف لائے اور آنے کے بعد وہیں کھڑے کھڑے دو چار منٹ میں کچھ نصیحت فرمائی (حضرت کا معمول تھا کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے، کھاتے، پیتے ہر موقع پر کچھ نہ کچھ ارشاداتِ عالیہ کا سلسلہ اور نصائح کا سلسلہ جاری رہتا تھا) ایک بات تو یہ فرمائی کہ ہم لوگ فلاں جگہ سے چلے تھے، اتنے بجے اور غالباً یہ فرمایا کہ پون گھنٹے میں یہاں پہنچ گئے، یہ کہنے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دیکھو! جب انسان نے لوہے پر، دھاتوں پر اور ان دنیوی اشیا پر، ان اسباب پر محنت کی، تو اس محنت کے نتیجے میں یہ ہوا کہ جو کام پہلے بہت دیر سے ہوتے تھے، وہ اب بہت تیز رفتاری سے ہونے لگے، جو سفر پہلے کئی مہینوں میں ہوتا تھا، اب گھنٹوں میں ہونے لگا اور یہ نتیجہ ہے دھات پر، لوہے پر، ان چیزوں پر محنت کا، انسان نے ان چیزوں پر محنت کی، تو یوں پرواز ہونے لگی۔ پھر فرمایا کہ اگر انسان اپنی روح پر محنت کرے، تو کیا وہ روحانی پرواز کر کے ''عالمِ ملکوت'' کو نہیں پہنچ سکتا؟

یہ حضرت کے جملے ابھی تک مجھے یاد ہیں! اگر چہ بہت پرانا واقعہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی پندرہ بیس سال پرانا واقعہ ہے؛ لیکن بہ ہر حال بزرگوں کی باتیں بڑی نصیحت آمیز بھی ہوتی ہیں اور بڑی نصیحت آموز بھی ہوتی ہیں۔ ''آمیز'' کے معنے نصیحت سے ملی ہوئی اور ''آموز'' کے معنے پڑھائی ہوئی کہ اس کے اندر نصیحت کا سبق موجود ہے، تو ہمارے لیے اس کے اندر بڑی نصیحت ہے کہ انسان جیسے اپنے جسم پر محنت کرتا ہے، جسمانیات پر محنت کرتا ہے، اسی طرح انسان کو چاہیے کہ اپنی روح کو پرواز دینے کے لیے محنت ومجاہدہ کرے؛ مگر افسوس کہ آج ہماری ساری محنتیں ظاہر پر ہورہی ہیں، ساری محنتیں ہمارے جسم پر ہورہی ہیں، یہاں سے وہاں تک کہیں بھی

دیکھتے چلو؛ ہر آدمی کو اپنے ظاہر اور مٹی والے جسم اور مٹی سے بنی اشیا اور انھیں سے متعلق جتنی چیزیں ہیں، انھیں کی طرف پوری پوری توجہ کرتے آپ دیکھیں گے۔

روح اصل ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے مادیت کو اور جسم وجسمانیات کو اصل سمجھ لیا ہے؛ حالاں کہ روح اصل ہے، جسم اصل نہیں ہے؛ روح میں اور ہمارے جسم میں ایسا ہی واسطہ اور تعلق ہے، جیسے ایک کار میں اور کار والے میں ہے؛ آپ بتائیے کہ کار قیمتی ہے یا کار والا قیمتی ہے؟ ایک صاحب کار کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں، آپ کو کار نظر آرہی ہے، کار ٹھیک ہے دس لاکھ کی، بیس و پچاس لاکھ کی، اب تو کروڑوں میں بھی ہے؛ لیکن آپ کتنی بھی اس کی قیمت لگائیں، سوال یہ ہے کہ کار میں بیٹھے ہوئے جو صاحب ہیں "صاحبِ کار"، ہم عام طور پر ان کو بے کار سمجھ رہے ہیں، جب کہ وہ "صاحبِ کار" ہیں اور جب کار کی یہ حیثیت ہے، تو صاحبِ کار کی کیا حیثیت؟ اسی طرح ہمارے جسم کو سمجھنا چاہیے کہ یہ ہماری کار ہے، یہ ہماری موٹر ہے اور اس کے اندر ہم بیٹھے ہوئے ہیں؛ اسی لیے آپ کہتے ہیں میرا جسم! اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آپ کا جسم ہے، آپ کچھ اور ہیں، آپ کہتے ہیں میری آنکھ! اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود آنکھ نہیں ہیں، یہ آپ کی آنکھ ہے اور آپ خود کچھ اور ہیں؛ آپ کہتے ہیں: میرا منھ، میرا ہاتھ، میرا پیر، میرا سر، میرا فلاں؛ تو اس کا مطلب ایسے ہی ہے کہ جیسے آپ کہتے ہیں: میرا گھر، تو آپ خود گھر تو نہیں ہیں؟ گھر کچھ اور ہے آپ کچھ اور ہیں؛ اسی طرح جب آپ کہتے ہیں کہ میرا جسم؛ تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کچھ اور ہیں اور آپ کا جسم کچھ اور ہے، آپ کا جسم؛ آپ نہیں۔ آپ کیا ہیں؟ وہ آپ اندر ہیں، جو اندر سے بول رہے ہیں، اندر سے دیکھ رہے ہیں، یہ آنکھ نہیں دیکھتی، آپ

دیکھتے ہیں، یہ زبان نہیں بولتی، آپ بولتے ہیں، یہ کان نہیں سنتے، آپ سنتے ہیں، یہ دماغ کام نہیں کرتا، آپ کام کرتے ہیں؛ ورنہ تو تھوڑی دیر کے لیے سوچیے کہ جب انسان کے اندر سے یہ روح نکل جاتی ہے، ہاتھ تو موجود ہوتا ہے، کام کیوں نہیں کرتا؟ آنکھ تو موجود ہے، کام کیوں نہیں کرتی؟ حالاں کہ سب موجود ہے؛ لیکن ایک ذراسی چیز نکل گئی اور وہ ہے انسان کی روح، معلوم ہوا کہ روح اصل ہے۔

ایک لطیفہ

وہ لطیفہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک صاحب کا انتقال ہوگیا، تو گھر کے لوگ پریشان ہوگئے، انھوں نے کہا کہ بھائی کیا ہوگیا؟ ابھی تو اچھے خاصے بیٹھے ہوئے تھے، باتیں کررہے تھے؟ ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا اور کہا گیا کہ یہ تو ابھی اچھے خاصے تھے، دیکھیے ڈاکٹر صاحب! اب نہ بولتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ کچھ کرتے ہیں، بس پڑے ہوئے ہیں، کیا ہوگیا ان کو؟ ڈاکٹر صاحب نے اپنے آلات کے ذریعے ان کو دیکھا، ان کی تشخیص کی، نبض دیکھی اور پھر اس کے بعد کہا کہ ان کو تو کچھ نہیں ہوا ہے، ماشاءاللہ سب ٹھیک ٹھاک ہے، بس ذراسی یہ بات ہوگئی کہ روح نکل گئی۔

ارے وہ ذراسی چیز جو ہے، وہی تو سب کچھ ہے؟ اگر وہ اندر نہ ہو؛ تو آنکھ موجود ہوتے ہوئے بھی کام نہیں کرسکتی اور دماغ بہ ظاہر موجود ہوتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود کام نہیں کرتا؛ اس لیے کہ آپ اس کے اندر موجود نہیں ہیں، جب تک آپ موجود ہیں سب موجود ہے، سب کام کررہے ہیں؛ لیکن آپ اندر موجود نہ رہے، تو یہ سب کے سب اندر بے کار ہوجاتے ہیں۔

کار سے زیادہ کار والے کی فکر کریں

یہ ہمارا جسم دراصل سواری ہے اور ہم اس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور اس میں

سوار ہیں، سوار کی حیثیت سواری کی بہ نسبت بہت اونچی ہوتی ہے؛ لیکن اتنی اونچی ذات، اتنی اہم ترین ذات؛ لیکن اس کے باوجود ہماری توجہ ہماری کار کی طرف تو ہے اور خود ہماری طرف نہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہوئی، جیسے ایک صاحب نے کار خریدی، کار کی مرمت کر رہے ہیں اور اس کی پینٹنگ کر رہے ہیں، کار کو سجا رہے ہیں اور جب دیکھو اسی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؛ لیکن خود صاحبِ کار کے نہ کپڑے اچھے ہیں، نہ کھانا ڈھنگ کا! بھوک لگ رہی ہے، کھانا نہیں کھاتا اور پراگندہ بال، پراگندہ حال، کوئی اس کو قریب بھی نہ بٹھائے اور یہ صاحب ہیں کہ کار کی پوری خدمت انجام دے رہے ہیں، تو گویا صاحبِ کار نے اپنی کار کی خدمت کر کر کے اپنے آپ کو کار کا غلام بنالیا ہے؛ حالاں کہ اللہ نے کار کو غلام بنایا تھا اور اس کو صاحبِ کار بنا کر آقا کا مقام دیا تھا۔

اسی طرح آج ہم لوگ ہمارے جسم کی خدمت میں لگ گئے، جب دیکھو ہمارے جسم کو بنانے میں، سنوارنے میں، اس کو کھلانے میں، اس کو پلانے میں اور اس کو بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں؛ لیکن خود ان کو اپنی طرف کوئی توجہ نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو سنواروں اور بناؤں؛ یعنی روح کو سنواروں اور بناؤں؟

روح کی غذا بھی ہے، دوا بھی ہے

روح کیسے سنورے گی؟ روح کی غذا کیا ہے؟ روح کی دوا کیا ہے؟ روح کی زیب و زینت کیا ہے؟ روح کو قوت دینے والی چیزیں کیا ہیں؟ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے جسم کے لیے یہ ساری چیزیں پیدا کر رکھی ہیں، کھانا اس کے لیے پیدا کیا، بیمار ہو جائے؛ تو دوا اس کے لیے تیار فرمائی اور اگر یہ کم زور ہو جائے؛ تو اس کو قوت دینے والی چیزیں اللہ نے پیدا کیں، اسی طرح اس کی زیب و زینت کے

لیے بے شمار اشیا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں، تو جس طریقے پر جسم کے لیے اللہ نے سب کچھ پیدا کیا، اسی طریقے پر ہماری روح کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اس سے اعلیٰ وارفع چیزیں اللہ نے پیدا کیں۔

روح کے لیے بھی غذا موجود ہے اور اس کے لیے دوا بھی موجود ہے، روح کے لیے زیب وزینت کی اشیا بھی موجود ہیں اور روح کے لیے تقویت اور قوت کا سامان بھی اللہ نے تیار کر رکھا ہے؛ لیکن یہ ساری کی ساری چیزیں جس طرح روح ہم کو نظر نہیں آتی، اسی طرح یہ چیزیں بھی ہم کو نظر نہیں آتیں۔ روح کی دوا ہم کو نظر نہیں آتی، روح کی زیب وزینت کے اسباب نظر نہیں آتے، روح کی تقویت کا سامان نظر نہیں آتا؛ لیکن یہ سب کچھ موجود ہے۔

انبیا کو جو نظر آتا ہے، ہمیں نظر نہیں آتا

اب آپ کہیں گے کہ پھر ہم کیا کریں جب نظر ہی نہیں آتا؟ جنابِ عالی! مجھے اور آپ کو نظر نہیں آتا؛ اس لیے کہ ہم اندھے ہیں، ہماری آنکھ میں وہ طاقت وقوت نہیں ہے، جو ان چیزوں کو دیکھ سکے؛ لہٰذا کسی بینا سے پوچھیے گا؛ اگر اندھے کو نظر نہیں آتا، تو اس کا اصول اور اس کا ضابطہ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی نظر آنے والے سے پوچھیے کہ جنابِ عالی! میں فلاں جگہ جانا چاہتا ہوں؛ مگر مجھے راستہ دکھائی نہیں دیتا؛ لہٰذا آپ مجھے راستہ بتا دیجیے، میں کھانا تو کھانا چاہتا ہوں؛ لیکن میرا دسترخوان مجھے نظر نہیں آتا، ذرا آپ بتا دیجیے، دستر پر مجھے بٹھا دیجیے، وہ آپ کو بٹھا دے گا؛ یہی اصول اور یہی ضابطہ ہے کہ جیسے ظاہری اندھا، ظاہری آنکھوں سے نابینا انسان اگر اس کو نظر نہیں آرہا ہے، تو کسی اور آدمی سے کہتا ہے کہ مجھ کو دکھا دو، اسی طرح ہم کو نظر نہیں آتا، آپ کو نظر نہیں آتا؛ تو انبیائے کرام علیہم السلام سے پوچھیں، انبیا کو اللہ

تعالیٰ نے وہ روحانی آنکھیں عطا فرمائی ہیں کہ ان کو سب نظر آتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿وکذٰلک نُرِی اِبرٰاهیمَ مَلَکُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضَ﴾ (الانعام: ۷۵)

(ہم نے ابراہیم کو دکھایا ملکوتِ سماوات اور ملکوتِ ارض۔)

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دکھایا، وہ وہ چیزیں دکھائیں کہ کوئی اوران کو دیکھ نہیں سکتا۔

اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم ایک جگہ فرماتا ہے کافروں سے خطاب کرتے ہوئے:

﴿أَفتُمَارُونهُ عَلیٰ مایریٰ﴾ (النجم: ۱۲)

(تم نبی سے جھگڑا کرتے ہو ان امور میں، جن کو نبی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؟)

تم کو نظر نہیں آرہا ہے تم اندھے ہو، نبی کہتا ہے کہ جنت ہے، نبی کہتا ہے کہ دوزخ ہے، نبی کہتا ہے کہ روحانی غذا ہے، نبی کہتا ہے کہ تمھاری روح کا سامان ہے، نبی کہتا ہے کہ تمھاری روح کی غذائیں اور اس کی دوائیں، اللہ نے میرے ذریعے بھیجی ہیں؛ یہ نبی کہتا ہے؛ لیکن لوگ نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ہم کو تو نظر نہیں آرہا ہے، دکھاؤ ہم کو دکھاؤ!

اگر سورج کو دیکھنے والا دیکھ رہا ہو اور اندھے کو سورج نظر نہیں آرہا ہے اور وہ کہنے لگے کہ نہیں نہیں، تم غلط کہہ رہے ہو، مجھے تو نظر نہیں آرہا ہے۔ اب اس سے یہی تو کہا جائے گا کہ ارے نابینا! ارے اندھے! دیکھنے والوں سے جھگڑا کرتا ہے!! اسی طرح ایک دل کی اور روح کی آنکھ ہوتی ہے، اللہ وہ نبیوں کو عطا کرتا ہے، نبی ان چیزوں کو دیکھتا ہے، لاتا ہے اور بتاتا ہے۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم مان لیں کہ نبی نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور اسے قبول کرتے چلے جائیں۔

روح کی غذا کیا ہے؟

نبی نے ہم کو بتایا ہے کہ نماز تمھاری غذا ہے، ذکر تمھاری غذا ہے، تلاوت تمھاری غذا ہے، عبادت تمھاری غذا ہے اور تم روحانی طور پر بیمار ہو جاؤ، تو یہ ذکر تمھارے لیے دوا کا کام کرتا ہے، تمھارے نفسوں کی اصلاح کرتا ہے، تمھارے قلوب کا تزکیہ کرتا ہے، تمھارے اندر کی بیماریوں کو نکالتا ہے اور اگر تم کو زیب و زینت کی ضرورت ہے، تو زیب و زینت بھی ان ہی چیزوں کے اندر اللہ نے رکھی ہے؛ اگر تم اللہ کے پاس قلبِ سلیم کے ساتھ جانا چاہتے ہو، ''قلبِ سلیم'': سجا ہوا دل، پاکیزہ دل ،سلامتی والا دل، بڑا خوب صورت دل لے جانا چاہتے ہو؛ تو اس کے لیے بھی اللہ نے سنوارنے اور بنانے کی چیزیں بھیجی ہیں، ذکر سے سنوارو، اللہ کے کلام کی تلاوت سے اسے سجاؤ؛ لیکن ہم ہیں کہ ان ساری چیزوں کو یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں، ان سب کو چھوڑ رکھا ہے اور ہماری پوری توجہ اپنے ظاہر کو بنانے اور اس کو سنوارنے میں خرچ ہو رہی ہے۔

جسم کا بھی حق ہے

میری بات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جسم کا کوئی خیال نہیں کرنا چاہیے، جسم بے کار ہے، نہیں ؛ بل کہ بسا اوقات اپنے جسم کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا ضروری ہوتا ہے، مثلاً کھانا ضروری ہے، پینا ضروری ہے، رہائش ضروری ہے اور کچھ اس طرح کی ضرورتیں انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اگر ان کو اختیار نہیں کرے گا، تو ظاہر بات ہے کام نہیں چل سکے گا؛ اس لیے انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں کس حد تک جسم کے تقاضوں پر عمل کروں؛ تا کہ میرا جسم باقی رہے۔

اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک آدمی نے کار خریدی ہے اور اس کو اس کار سے آنا جانا پڑتا ہے، تو کار کی نگرانی کرے گا کہ نہیں کرے گا؟ کار میں پیٹرول ڈالتا رہے گا کہ نہیں ڈالے گا؟ کار میں آیل (Oil) ختم ہو جائے، تو اس کو بھی ڈالتا رہے گا کہ نہیں ڈالے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کار میں ڈالنا ضروری ہے، اس کی نگرانی بھی ضروری ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ نہیں جناب! میں تو کار کی کوئی پرواہ نہیں کرتا وہ رہے، نہ رہے، میں تو اپنے آپ کو بنانے میں لگا رہوں گا، یہ بھی غلط ہے۔ کار کی بھی انسان کو ضرورت پڑے گی، کار خریدا ہے؛ تو کار کی نگرانی کرنا بھی بہت ضروری ہے؛ تاکہ وہ ضرورت کے موقع پر کام آجائے۔

یہاں ایک حدیث یاد آئی کہ حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو الدردا رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارگی قائم کی تھی، ایک بار حضرت سلمان، ابوالدردا کے یہاں گئے، تو ان کی بیوی کو خستہ حال میں دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ کے بھائی ابوالدردا کو دنیا کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ پس اتنے میں حضرت ابو الدردا آ گئے، ان کے لیے کھانا بنایا اور کہا کہ کھائیے! انھوں نے کہا کہ میں روزہ دار ہوں، حضرت سلمان نے کہا کہ میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک آپ ساتھ میں نہیں کھائیں گے۔ یہ سن کر ابوالدردا نے کھانا کھالیا، پھر جب رات ہوئی؛ تو ابو الدردا نماز کی تیاری کرنے لگے، حضرت سلمان نے کہا کہ سو جائیے، پس وہ سو گئے، پھر کچھ دیر بعد اٹھنے لگے؛ تو حضرت سلمان نے

فرمایا کہ سو جائیے، پھر وہ سو گئے اور جب آخر رات ہوئی؛ تو حضرت سلمان نے فرمایا کہ اب اٹھیے، پھر دونوں نے نماز پڑھی۔

پھر فرمایا:

« إِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقّاً، وَ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقّاً، وَ لِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقّاً ، فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ. »

(بلاشبہ تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمھارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے؛ لہٰذا ہر ایک حق دار کو اس کا حق دو۔)

یہ سن کر حضرت ابو الدرداؓ حضرت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور سارا قصہ بیان کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا۔

(البخاري:۱۹۶۸،الترمذي:۲۴۱۳،صحيح ابن خزيمة:۲۱۴۴،صحيح ابن حبان:۳۲۰، مسند بزار:۴۲۲۳،سنن الدارقطني:۲۲۳۵،سنن البيهقي:۸۶۰۴،تهذيب الآثار:۷۹۳)

معلوم ہوا کہ جسم اور نفس کا بھی انسان پر حق ہے، الغرض اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو روح عطا فرمائی ہے، اس کی سواری اس جسم کو بنایا ہے، اس جسم کو بھی پالتے رہنا ضروری ہے؛ لیکن یہ نہیں کہ بس اسی کے پیچھے ہو جائے اور اسی کا خادم بن جائے۔ خادم نہیں، مخدوم بن کر اس سے کام لیتا رہے، کار ہماری خادم ہے، اسی طرح یہ جسم ہمارا خادم ہے؛ لہٰذا ضرورت کے مطابق اس کو کھلاؤ، پلاؤ؛ تاکہ آپ کو نماز پڑھنے میں، ذکر و تلاوت کرنے میں، تہجد پڑھنے میں، اللہ کے کاموں کے کرنے میں، اللہ کے دین کی خدمت میں اور مختلف اس طرح کے کاموں میں یہ بدن آپ کو لیے لیے پھرتا رہے۔ اگر نہیں کھلائیں گے؛ تو وہیں پڑا رہے گا اور آپ کی نماز بھی جائے گی،

تلاوت بھی چلی جائے گی اور بھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔

جب اس طریقے پر ہم جسم کو اس کی غذا دے کر اور اس کو تیار کر کے، اس کو ہم اللہ کے دین کے لیے اور اپنی روح کو بنانے اور اس کو ترقی دینے کے لیے استعمال کریں گے، تو نتیجہ وہ ہوگا، جو اللہ چاہتے ہیں کہ انسان ''ملأِ اعلیٰ'' سے تعلق پیدا کر لے، فرشتوں والی صفات اپنے اندر پیدا کر لے، یہی اللہ کو منظور ہے کہ انسان کے اندر وہ صفات پیدا ہوتی چلی جائیں۔

اب انسان کھا رہا ہے پی رہا ہے؛ لیکن اس کا وقت اصل میں خرچ ہو رہا ہے اپنی روح کو بنانے کے لیے اور اپنی روح کی ترقی کے لیے؛ لہٰذا وہ ترقی کرتی چلی جائے گی۔

مجاہدہ کیا اور کیوں؟

بات یہاں سے چلی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک آزمائش اور امتحان میں رکھا ہے اور آزمائش اس طرح ہے کہ جسم اس دنیا کا عطا کیا گیا اور ہمارے اندر جو روح رکھی گئی، وہ آسمانوں سے بھیجی گئی؛ مٹی کے تقاضے کچھ اور ہیں اور روح کے تقاضے کچھ اور ہیں! یہاں آزمائش ہو رہی ہے، اس آزمائش کے موقع پر انسان اپنی عقل کو برتے اور عقل کے ذریعے فیصلہ کرے کہ مجھے کس کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہیے اور کس حد تک کس کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہیے؟

یہی وہ چیز ہے، جس کا نام شریعتِ اسلام کے اندر ''مجاہدہ'' ہے، مجاہدہ کیا ہے؟ مجاہدہ یہ ہے کہ انسان کے سامنے یہ مختلف تقاضے، متضاد تقاضے آتے ہیں اور کوئی اسے آگے کھینچتا ہے اور کوئی پیچھے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، کوئی نیچے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، تو کوئی اوپر کی طرف آپ کو لے جانا چاہتا ہے، ایسے موقع پر انسان ایک عجیب قسم کی کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے، یہی در اصل اس کا امتحان و آزمائش ہے اور

جب اس کش مکش کے موقع پر انسان اپنی عقل سے اپنی بصیرت سے، اپنے ایمان سے ان متضاد تقاضوں میں سے روحانی تقاضے کو اُبھارتا ہے اور اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے چل پڑتا ہے، تو بس سمجھئے کہ وہ اس مجاہدے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس آزمائش کے موقع پر انسان کو کام یاب ہونے کی کوشش کرنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ امتحان کے موقع پر کوشش نہیں کیا، تو پھر امتحان میں ناکام ہو جائے گا۔ جب یہ کش مکش میں مبتلا ہو، تو یہاں پر انسان اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک کرے، اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنے کی کوشش کرے، برابر یہ سوچتا چلا جائے کہ میں جسم کے پیچھے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے پیچھے نہ لگوں؛ بل کہ روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے پیچھے لگ جاؤں۔

اللہ تعالی نے اسی کو فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ٦٩)

(جو لوگ ہمارے راستے میں جدو جہد کرتے ہیں، ہم ان کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔)

اس کے اندر اللہ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں: ایک تو یہ فرمایا کہ اللہ آزمائش کراتے ہیں؛ لیکن آزمائش کے موقع پر جو بندے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور محنت و مجاہدہ اختیار کرتے ہیں، اللہ ان کے لیے ضرور اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ راہیں کھولتے ہیں، تو پریشانی کی کوئی بات نہیں، بس محنت چاہیے، مجاہدہ چاہیے، یہاں پر زیرکی و بیدار مغزی چاہیے اور ذرا سی ہمت چاہیے اور اپنے نفس پر کنٹرول رکھنے کی کوشش چاہیے؛ اگر انسان اس کے اندر کام یاب ہو گیا، تو وہ آگے بڑھتا رہے گا اور اگر محنت نہیں کرے گا، مجاہدہ نہیں کرے گا؛ تو کبھی کام یاب نہیں ہو سکتا۔

ہماری ناکامی کا راز

سب لوگ تو اپنی کامیابی کا راز بتاتے ہیں، میں اپنی کم ظرفی کی وجہ سے ہماری ناکامی کا راز بتا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگ آج محنت ومجاہدے کی عادت کھو چکے ہیں، صحابہ کے مجاہدات کو یاد کریں، تابعین کے مجاہدات کو یاد کریں، تبعِ تابعین کے مجاہدات کو یاد کریں، ہمارے اکابرین واسلاف کے مجاہدات کو یاد کریں، وہ کیسے مجاہدات میں لگے ہوئے ہوتے تھے! ، یہ مجاہدات تھے، جس کی وجہ سے وہ ترقی کر گئے اور آج ہم نے مجاہدہ بالکل چھوڑ دیا ہے، کسی قسم کا کوئی مجاہدہ نہیں، کھانے میں کوئی مجاہدہ نہیں، پینے میں کوئی مجاہدہ نہیں، نیند میں کوئی مجاہدہ نہیں، بات چیت میں کوئی مجاہدہ نہیں اور کسی بھی قسم کی کسی بھی چیز میں کوئی مجاہدہ نہیں۔

دنیا حاصل کرنے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنے والے نظر آتے ہیں، دنیا جمانے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنے والے نظر آتے ہیں، مال کمانے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنے والے نظر آتے ہیں، فانی دنیا کی ڈگریوں کے لئے محنت ومجاہدہ کرنے والے نظر آتے ہیں، اپنی دکان، اپنی فیکٹری، اپنی کمپنی چلانے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنے والے نظر آتے ہیں؛ لیکن اپنی روح کی ترقی کے لیے، اپنی جنت بنانے کے لیے، اپنی آخرت بنانے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنے والے دور دور تک نظر نہیں آتے، اسی وجہ سے ہم اخروی اعتبار سے ناکام ہیں۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

مجھے یہاں ایک چونکا دینے والی حدیث یاد آ گئی، حضرت آقائے دو جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا رأيتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا وَ لَا مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا. » (الترمذي:٢٦٠١)

(میں نے دوزخ جیسی خطرناک چیز نہیں دیکھی، جس سے بھاگنے والے سوتے رہتے ہوں اور نہ جنت جیسی چیز دیکھی، جس کے طالب غفلت کی نیند میں ہوں۔)

اس حدیث کی شرح میں علامہ مناوی رَحِمَہُ اللہُ لکھتے ہیں کہ دوزخ اس قدر شدید ہے؛ لیکن اس سے ڈرنے والے سورہے اور غفلت میں مبتلا ہیں، حالاں کہ کسی خوف ناک چیز سے بھاگنے والے کا یہ انداز نہیں ہوا کرتا؛ بل کہ وہ تو گناہوں سے طاعات کی جانب لپکتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس جملے میں تعجب کے معنے ہیں کہ اللہ کے رسول تعجب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بڑا تعجب ہے کہ دوزخ کا حال تو اس قدر خوف ناک وشدید ہے؛ مگر اس سے خوف کھانے والا اپنی غفلت میں مبتلا ہے اور جنت اس قدر حسین وجمیل اور راحت وسکون کی جگہ ہے؛ مگر اس کا چاہنے والا بھی غفلت کی نیند سویا ہوا ہے! (فیض القدیر:۵/۵۶۹)

مجاہدے چار ہیں

اب یہ سمجھنا ہے کہ ہمیں مجاہدہ کس طرح کرنا ہے؟ سنیے کہ علما نے لکھا ہے کہ مجاہدے چار ہیں: تقلیلِ کلام، تقلیلِ طعام، تقلیلِ منام اور تقلیلِ اختلاط مع الانام۔

میں یہاں ان کی کچھ تفصیل عرض کرتا ہوں؛ تاکہ ہمیں سمجھ میں آجائے کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟

(۱) **تقلیل کلام**: ایک مجاہدہ ہے تقلیلِ کلام، بات کم کرنے کا مجاہدہ اور بات کم کرنے سے مقصود یہ ہے کہ دنیوی بات کے بہ جائے زبان کو اللہ کے ذکر اور

تلاوت یا کسی دینی کام میں صرف کیا جائے۔ یہ بہت اہم مجاہدہ ہے اور جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے؛ اس لیے بہت سے حضرات نماز روزہ سب کرتے ہیں؛ مگر کلام میں کمی کرنا ان کے لیے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

آج تو لوگ بات بہت کرتے ہیں، ہر آدمی بات کرنے کا ماہر ہو گیا ہے، کام کا ماہر نہیں، ہر آدمی ''قوّال'' بن گیا ہے، فعّال بننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ ''قوال'' کے معنے کیا؟ بہت بولنے والا، ایک قوال گانے والے کو بھی بولتے ہے؛ لیکن میں قوال اس کے اصلی معنے کے اعتبار سے بول رہا ہوں، ''قول'' سے بنا ہے، قوال کے معنے ہیں؟ بہت بکواس کرنے والا، قوال مبالغے کا صیغہ ہے اور ''فعال'' کے معنے کام کرنے والا، آج ہم فعال بننے کے بہ جائے قوال بن گئے ہیں، ہر آدمی بول رہا ہے؛ بولنے سے کام نہیں چلتا، کام سے کام چلتا ہے؛ اس لیے تقلیلِ کلام چاہیے، یعنی بات چیت صرف ضرورت کی کی جائے، بلا ضرورت نہ کی جائے اور سوچ سمجھ کر کی جائے۔ بات زیادہ کرنا یہ ہمارے جسم کا تقاضہ ہے، اس جسم کے تقاضے کو ختم کرو، جب جسم کا تقاضہ کم ہو جائے گا یا ختم ہو جائے گا اور اس کے بہ جائے ذکر و تلاوت کا زیادہ اہتمام ہوگا، تو روح کو ترقی ملے گی؛ کیوں کہ فرشتے اللہ کے ذکر میں ہمہ وقت لگے رہتے ہیں، اس سے ان کے ساتھ مشابہت پیدا ہوگی اور روحانیت ترقی کرے گی۔

(۲) **تقلیلِ طعام** دوسرا مجاہدہ ہے، جس کا نام تقلیلِ طعام (کھانے میں کمی) اس لیے کہ کھانے میں زیادتی بھی در اصل یہ جسم کا تقاضہ ہے۔ اس کے بہ جائے کم کھایا جائے، تو چوں کہ فرشتے کھاتے ہی نہیں؛ اس لیے ان سے مشابہت پیدا ہوگی اور روحانیت کو فروغ ملے گا۔

مگر اب لوگ ہیں کہ خوب کھا رہے ہیں، اچھا بھی، برا بھی، مزے دار بھی اور یہ

بھی وہ بھی؛ اس لیے آج آپ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ ہوٹلوں کی بھر مار ہوگئی ہے، خصوصاً ہمارے علاقے: بنگلور والوں کے لیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھانا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے، ہر روڈ پر پتہ نہیں کتنی دکانیں کھل گئیں؟ کوئی چکن کا ماہر ہے، تو کوئی بریانی کا، کوئی کسی اور کا، مختلف اور متنوع قسم کے کھانے، بس کھانے ہی کھانے؛ حتی کہ رمضان آتا ہے، تو رمضان میں بھی ہم بے چارے پیٹ کو فرصت دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہمارے ایک دوست سنا رہے تھے کہ ایک بار اُن سے ایک ہندو نے سوال کیا کہ بھائی! وہ آپ لوگوں کے زیادہ کھانے کا مہینہ کب آرہا ہے؟ تو ان کو بڑی پریشانی ہوئی اور وہ سوچنے لگے کہ یہ کونسا مہینہ ہے زیادہ کھانے کا؟ ہمارے یہاں تو ایسا زیادہ کھانے کا مہینہ نہیں آتا؛ اس ہندو نے کہا کہ وہ آتا ہے نا ''رمضان'' کا مہینہ، جس میں دن بھر تو کچھ کھاتے نہیں؛ لیکن پوری رات کھاتے رہتے ہیں۔

صحیح کہا اس نے؛ میں دیکھتا رہتا ہوں کہ رمضان میں لوگ افطار کے وقت مسجدوں میں آتے ہیں، تو لمبے لمبے دستر ہوتے ہیں اور مسجد سے باہر نکلتے ہیں، تو باہر بھی کھڑے کھڑے کھا رہے ہوتے ہیں؛ کھڑے کھڑے کھانا تو انسانوں کا طریقہ نہیں ہے، جانوروں کا طریقہ ہے؛ لیکن یہاں نماز پڑھا روزہ دار صاحب نے اور باہر نکلتے ہی جانور بن گئے۔ کتنی افسوس کی بات ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو جسم کے تقاضوں میں لگا کر، یہ تک خیال نہ کیا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ فرشتہ بنانا چاہتا تھا اور ہم تو گدھے اور گھوڑے بن گئے۔

کھانے میں کمی کا مطلب علما نے یہ بیان کیا ہے کہ ضرورت کے مطابق کھاؤ، ضرورت سے زیادہ نہ کھاؤ، ہاں! ضرورت کے مطابق کھاؤ؛ اس لیے کہ کار کو پیٹرول

دینا بھی ضروری ہے؛ اگر برابر پیٹرول نہیں پڑے گا، تو نماز کیسے پڑھیں گے آپ؟ تبلیغ میں کہاں جائیں گے آپ؟ پیر آپ کا ساتھ کیسے دے گا؟ یہ دماغ آپ کا ساتھ کیسے دے گا؟ لہٰذا اتنا پیٹرول اس کو ڈال دیا کرنا؛ تا کہ وہ آپ کو لے کر پھرے اور اللہ کے دین کا کام کرے اور نماز بھی پڑھوائے اور دیگر کام بھی آپ کے ہوتے رہیں؛ اس لیے ضرورت سے کم نہ کھائیں؛ لیکن زیادہ بھی نہ کھائیں، یہ ہے تقلیلِ طعام کا مطلب۔

(۳) **تقلیلِ منام** : تیسرا مجاہدہ ہے تقلیلِ منام، سونے میں کمی؛ اس لیے کہ سونا بھی جسم کا تقاضہ ہے، روح کا تقاضہ سونے کا نہیں ہے، جو ہم سوتے ہیں وہ ہمارا جسم سوتا ہے؛ اس لیے کہ جسم تھک جاتا ہے اور جب تھک جاتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتِ بالغہ ہے کہ اس کے اوپر نیند طاری کر دی جاتی ہے؛ تھکان کی وجہ سے ایک قسم کا گیاس (Gas) اس کے اندر پیدا ہوتا ہے اور وہ گیاس دماغ کے اوپر اثر انداز ہوتا ہے اور جب وہ اثر انداز ہوتا ہے، تو دماغ چاہتا ہے کہ وہ آرام کرے؛ اس لیے انسان سوجاتا ہے۔ جب سوجاتا ہے اور کچھ دیر کے لیے اسے راحت مل جاتی ہے اور اس کی ایکٹیویٹیز (Activities) اور اس کی حرکتیں ختم ہو جاتی ہیں اور بہت دیر تک اسی طرح رہتا ہے، تو وہ گیاس آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔

دیکھیے! اللہ کی حکمت و مصلحت اور اللہ کا نظام کہ ہمارے جسم پر یہ سب کچھ ہوتا ہے؛ اس لیے حکم یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق سونا، ضرورت سے زائد نہ سونا۔

مگر یہاں بھی لوگ غفلت کرتے ہیں اور آدمی ایک تو پوری رات سوتا ہے اور صبح ہوئی تو صبح کے وقت بھی سوتا ہے، بہت سارے لوگ صبح فجر ہوئی، تو بھی سوتے رہتے

ہیں، بہت ہی محرومی کی بات ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا، جو سوتا رہا یہاں تک کہ صبح ہوئی؛ تو بھی نماز کے لیے نہیں اٹھا، تو آپ نے فرمایا: ''شیطان اس کے کان میں پیشاب کرتا ہے۔''

(البخاري :١١٤٤، مسند أحمد:٤٠٥٩)

غور کیجیے! کتنی بری بات ہے کہ کوئی شیطان کو موقع دے کہ آ اور میرے کان میں پیشاب کر، میں اپنے کان کو تیرے لیے بیت الخلا بنانا چاہتا ہوں ۔ لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ!!

ایک آدمی کو کان میں پیشاب نظر آنے کا واقعہ

علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، مشہور بزرگ ہیں، انھوں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ بغداد کی ایک مسجد میں ایک آدمی سویا کرتا تھا، ایک بار فجر کی نماز پر وہ اٹھا نہیں، نماز کھڑی ہوگئی، جماعت ہوگئی، اس کے بعد لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے، کوئی ذکر میں، کوئی تلاوت میں تو کوئی اور کسی کام میں؛ لیکن یہ آدمی وہیں سویا ہوا تھا، کچھ لوگوں نے دیکھا کہ ارے بھائی! یہ کون سو رہا ہے؟ اب اس کو اٹھایا گیا۔ علامہ شعرانی لکھتے ہیں کہ جب وہ اٹھا، تو اس کے کان سے پانی جیسا کوئی سیال یعنی لکوِڈ (Liquid) آنے لگا؛ لیکن اتنا بدبودار اور اس قدر بدبودار کہ لوگ وہاں پریشان ہو گئے۔

علامہ شعرانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس وقت علما نے بتایا کہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: جو آدمی صبح کی نماز چھوڑ کر سوتا ہے، شیطان اس کے کان میں پیشاب کرتا ہے۔

یہ وہی شیطان کا پیشاب ہے، جو اس کے کان سے نکل رہا تھا، کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان حقائق کو جو عام طور پر نظر نہیں آتے، اُنھیں ظاہر کردیتے ہیں، کبھی کبھی اس لیے ظاہر کردیتے ہیں؛ تاکہ ہمارا یقین بڑھ جائے اور ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ جو بھی نماز فجر چھوڑ کر سوئے گا، شیطان اس کے کان میں ضرور پیشاب کرتا ہے۔

گوشت کے پتھر بن جانے کا واقعہ

کبھی کبھی اللہ تعالیٰ حقائق کو ظاہر فرما دیتے ہیں، اس قسم کا ایک واقعہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک سائل حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر مانگتا ہوا آیا، دستک دے کر اس مانگنے والے نے سوال کیا کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو، گھر کے اندر سے بتایا گیا کہ اس وقت کوئی چیز نہیں ہے، چلے جاؤ؛ حالاں کہ اس وقت گھر میں گوشت موجود تھا، جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کسی صحابی یا صحابیہ کے مکان سے بھیجا گیا تھا؛ لیکن حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یا ان کی خادمہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیا ہے، اس فقیر کو کیسے دیں؟ انکار کر دیا۔

کچھ دیر بعد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے اور پوچھا کہ کھانے کی کوئی چیز موجود ہے؟ تو نوکرانی سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ وہ گوشت جو موجود ہے، وہ لے کر آؤ! وہ خادمہ گوشت اٹھانے گئی، تو دیکھتی ہیں کہ گوشت کی جگہ گوشت نہیں ہے؛ بل کہ گوشت ہی کی طرح پتھر رکھا ہوا ہے، اس نے چیخ کر کہا کہ یہاں تو پتھر ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اس کو لے آؤ، وہ لے آئی تو دیکھتے ہیں کہ اس کی شکل تو گوشت کی طرح ہے؛ لیکن وہ گوشت کا لوتھڑا تبدیل ہو چکا ہے پتھر میں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا یہاں کوئی سائل آیا تھا؟ کہا کہ جی آیا تھا، آپ نے فرمایا: تم نے کیا جواب دیا تھا؟ بتایا گیا کہ یہ

کہا گیا کہ کوئی چیز نہیں ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے دلوں کی سختی نے اس کو پتھر بنا دیا، تمھارے دلوں کی سختی کا اثر یہاں ظاہر ہو رہا ہے، اللہ دکھا رہا ہے، اس سے تم کو نصیحت کی گئی ہے۔ (دلائل النبوة للأصبهاني:۲/۱۰۴،أمتاع الأسماع:۵/۳۳۲)

اس طرح اللہ تعالیٰ کبھی حقائق ظاہر فرماتے ہیں؛ لیکن یہ روز روز تو نہیں ہوتا، ایک دفعہ دکھا دیا کہ دیکھو ہماری قدرت کے یہ حقائق ہیں، نظروں سے اوجھل؛ لیکن یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے، اب جہاں جہاں بھی اللہ کا کوئی بندہ بھیک مانگنے آیا اور ایک آدمی ہوتے ہوئے بھی سخت دلی کے ساتھ انکار کر دیا، تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ اس کے گھر میں اس وقت جو کچھ بھی ہے، وہ سب کچھ پتھر بن چکا ہے خدا کی نگاہ میں۔

الغرض بتا یہ رہا تھا کہ سونا بھی ضرورت کے بہ قدر ہونا چاہیے، نماز چھوڑ کر سونا یہ ضرورت سے زائد جسم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے، جس کی وجہ سے روح کی ترقی رک جاتی ہے؛ لہٰذا فجر سے پہلے ہی اٹھنے کی کوشش کریں، دو چار رکعت اللہ کے لیے پڑھ لیا کریں، رات میں اتنی دیر کے لیے آرام کر لیں کہ آپ کی تھکن دور ہو جائے اور آپ کی یہ گاڑی صبح میں اسٹارٹ (Start) ہو کر کام میں لگ جائے، بس اتنا سونا ہے۔

روح کی بیداری اور خواب کی حقیقت

یہ بھی جان لینا چاہیے کہ سونے کا تعلق، نیند کا تعلق ہمارے جسم کے ساتھ ہے، روح ہمیشہ جاگتی ہے، چوبیس گھنٹے میں ایسا نہیں ہے کہ ایک منٹ کے لیے بھی روح سوتی ہو؛ اسی لیے جب آپ سوتے ہیں، تب بھی روح آپ کے اندر کام کرتی رہتی ہے؛ حتیٰ کہ عالمِ ارواح کی سیر بھی کرنے لگتی ہے اور وہیں جا کر کچھ تماشے بھی دیکھ آتی ہے، جس کو آپ کہتے ہیں کہ مجھے خواب نظر آیا، یہ جو خواب نظر آتا ہے وہ کیا ہے؟

یہ روح کی سیر کے موقع پر جو کچھ اس کو نظر آتا ہے، وہ خواب ہے، یہ عالمِ ارواح کی سیر کرتی ہے، ادھر جاتی ہے، اُدھر جاتی ہے؛ لیکن کنکشن (Connection) آپ کے جسم سے باقی رہتا ہے اور اسی جسم سے کنکشن (Connection) کے باقی رہنے کی وجہ سے آپ زندہ کہلاتے ہیں؛ لیکن بہ ہر حال وہ اِدھر اُدھر جوگشت کرتی ہے اور نظارے دیکھتی ہے، تو یہاں پر آ کر آپ کہتے ہیں کہ مجھے خواب نظر آیا۔ یہ خواب اگر آپ ٹھیک ٹھیک دیکھ کر آتے ہیں، تو سچا ہوتا ہے، اگر ٹھیک ٹھیک دیکھ کر نہیں آتے، تو جھوٹا ہوتا ہے؛ اس لیے کہ دیکھنے دیکھنے میں بھی تو فرق ہوتا ہے؟ ایک آدمی جب دیکھتا ہے تو ٹھیک دیکھتا ہے اور ایک آدمی ذرا اچٹتی نگاہ سے دیکھ کر آجاتا ہے، دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ اچٹتی نگاہوں سے دیکھ کر چلا گیا، ٹھیک یاد نہیں رہا کہ کیا دیکھا کیا، نہیں دیکھا اور ایک آدمی ہے، جو ٹھیک ٹھیک دیکھ رہا ہے کہ ہاں! یہ مسجد ہے اور یہ مدرسہ ہے، یہ بلڈنگ ہے، وغیرہ۔ سب دیکھ رہا ہے اور جو دیکھا، وہ اس کو سمجھ میں آجاتا ہے؛ لیکن جو آدمی اچھی طرح نہیں دیکھتا، تو اس کا خواب الٹا سیدھا، یا پراگندہ حال ہوتا ہے۔ بہ ہر حال بتانا یہ ہے کہ روح سوتی نہیں ہے؛ لہٰذا سونا روح کا تقاضا نہیں، بل کہ جسم کا تقاضا ہے، اس کو کم سے کم بہ قدرِ ضرورت ہونا چاہیے۔

(۴) **تقليل اختلاط مع الأنام** : ایک مجاہدہ یہ ہے کہ لوگوں سے میل جول میں کمی کرے، بلا ضرورت لوگوں سے نہ ملے، ایسا نہ ہو کہ خواہ مخواہ اِن سے مل رہا ہے، اُن سے مل رہا ہے، اِن سے بات چیت، اُن سے بیٹھک، اُن کی مجلس اور اِن کی مجلس؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان بھی غلط استعمال ہو جاتی ہے، جھوٹ اور سچ کا فرق باقی نہیں رہتا، کبھی غیبت ہونے لگتی ہے، کبھی چغلیاں کھائی جانے لگتی ہیں اور کبھی ادھر اُدھر کی بکواس کی جانے لگتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو، تو اتنا ضرور ہوگا کہ آدمی اس اختلاط کے نتیجے میں دوسروں کے اثرات اپنے اوپر مرتب ہوتے دیکھے

گا؛ اس لیے کہ ملنے والے پتا نہیں کون کون ہوتے ہیں؟ برے لوگ ملیں گے، تو ان کے اثرات بھی مرتب ہوں گے۔

لہٰذا لوگوں سے میل جول کم ہو، ضرورت پر ملیں کہ کوئی اللہ کا بندہ آیا ملنے، تو مل لیں؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر وقت ایسے ہی ہوتا رہے اور ہر اچھی اور بری مجلس میں بیٹھیں اور ہر اچھے اور برے سے ملاقات کریں۔ اگر کسی ضرورتِ دینیہ سے بھی ملاقات کریں؛ تب بھی فوراً خلوت والا معاملہ اختیار کریں۔

حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللہُ کو خلوت کی فکر

حضرت مولانا شیخ الحدیث زکریا صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللہُ نے ''آپ بیتی'' کے اندر حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللہُ بانیٔ تبلیغی جماعت کا تذکرہ کیا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ آپ کتنے بڑے اللہ کے ولی تھے؟ کتنے بڑے داعی دین تھے اور کیسی تحریک انھوں نے چلائی کہ چہار دانگِ عالم میں اس کا چرچا ہو گیا اور اس کا فیض سارے عالم کے اندر پہنچ گیا۔

آپ کا مقولہ حضرت شیخ الحدیث رَحِمَہُ اللہُ نے نقل کیا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ حضرت مولانا منظور نعمانی رَحِمَہُ اللہُ نے حضرت کے ملفوظات کے اندر اس کا ذکر کیا ہے؛ چناں چہ ملفوظات میں بھی یہ موجود ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب میں چلّے میں جاتا ہوں، جماعت میں، یا گشتوں میں نکلتا ہوں، تو ہر قسم کے لوگوں سے میل ملاپ کے نتیجے میں دل پر ایک غبار پاتا ہوں؛ جس کی صفائی کے لیے سہارنپور اور رائے پور کی خانقاہوں میں جاتا ہوں۔

یہی وہ خلوت والا معاملہ ہے، اب دیکھو یہ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رَحِمَہُ اللہُ کا جانا اور آنا دنیا کے لیے نہیں تھا، یہ اللہ کے دین کے لیے تھا، اللہ کے دین

کی دعوت کے لیے تھا؛ لیکن ہر قسم کے آدمی سے میل ملاقات ہوتی ہے، اچھے سے بُرے سے اور اس میل ملاقات کا اثر دلوں پر پڑتا ہے؛ جب دعوت وتبلیغ دین کے لیے لوگوں سے میل ملاقات لا یہ اثر ہوسکتا ہے، تو دنیا ہی کے لیے ملاقاتوں کا سلسلہ رکھے، اس کا کیا حال ہوگا؛ لہٰذا ہمیں اور آپ کو کس قدر بچنا چاہیے ذرا اس کا اندازہ کریں؟!

نیک لوگوں سے بھی کم ملیں

ہاں! نیکوں کی صحبت نیکوں سے میل ملاپ تو اچھا ہے؛ لیکن ان سے بھی زیادہ نہیں ملنا چاہیے؛ اس لیے کہ آپ ان سے زیادہ ملیں گے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے معمولات میں فرق آئے گا، یا ہمارا اثر اُدھر مرتب ہوگا؛ اس لیے بزرگوں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ ان کی صحبت پاؤ، ان کی مجلسوں میں جاؤ، ان کی جوتیاں سیدھی کیا کرو؛ لیکن اس کے لیے بھی کچھ حدود مقرر ہیں، یہ نہیں کہ ہر وقت لگے رہو۔

ایک دفعہ ہم لوگ استاذی ومرشدی حضرت مسیح الامت رَحِمَہُ اللّٰہُ کے پاس مجلس سننے کے لیے حاضر ہوئے، تو حضرت نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور فرمایا کہ ''بھائی ٹنکی خالی ہے، بھرنے تو دو؛ اس لیے پھر کسی اور وقت آنا۔''

مطلب یہ تھا کہ ذکر کے انوار وبرکات اور روحانیت جو حاصل ہوتی ہے، لوگوں سے ملتے ملتے اس میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کو حضرت نے فرمایا کہ ''ٹنکی خالی ہے''؛ یعنی روحانیت والی ٹنکی، اب ''اس کو بھرنے تو دو!'' کیا مطلب؟ میں جاؤں خلوت میں رہوں، ذکر واذکار کروں اور خلوت میں رہتے رہتے یہ انوار بھر جائیں اور پھر اس کے بعد لوگوں سے جلوت ہو اور ملاقات ہو۔

اسی لیے امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا: میں علما کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ہر وقت

جلوت میں نہ رہیں؛ بل کہ کچھ وقت خلوت میں بھی گذارا کریں اور خلوت میں اپنے مالک سے تعلق کو جوڑیں؛ تاکہ وہاں سے جو روحانیت ان کے اندر پیدا ہو اور جو انوار و برکات کا نزول ان پر ہو، تو پھر جلوت میں آنے کے بعد اس کا اثر لوگوں پر ہوگا۔

جو خلوت کبھی نہ کرتا ہو، جلوت ہی جلوت میں رہتا ہو، وہ خالی خولی ہو جاتا ہے، جب وہ خالی ہو جاتا ہے، تو وہ دوسروں کو کیا دے سکتا ہے؟

یاد آرہا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا رحمہ اللہ یا ان کے شیخ کی بات ہے، اس وقت کچھ اشتباہ ہو رہا ہے، جب ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ تو ان کے آنسو نکل آئے، اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بھائی کیا کہوں! تم لوگ میرے سے بہت اچھے ہو، پوچھنے والے نے کہا کہ حضرت کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ دیکھو ہر وقت جلوت ہی جلوت نے مجھے معمولات سے دور کر دیا ہے۔

یعنی اس میں اشارہ ہے کہ ہر وقت لوگوں سے میل ملاپ اور جلوت ہی جلوت جو ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو خلوت نصیب نہیں ہوتی اور خلوت کا نصیب نہ ہونا؛ اللہ سے تعلق میں خلل ڈالتا ہے۔

یہاں تک کہ خود محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا؛ چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لاتے تھے، تو آپ اپنے گھر کے اندر کے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کر یا کرتے تھے: ایک جز اللہ کے لیے، ایک جز اپنے اہل و عیال کے لیے اور ایک جز اپنی ذاتی کاموں کے لیے، پھر آپ نے اپنے جز کو بھی دو حصوں میں کر دیا تھا کہ اس میں لوگوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتے تھے۔

(شرح السنة:۱۳/۲۷۲،شعب الإيمان:۳/۲۴،المعجم الكبير للطبراني:۱۷۸۶۸)

بعض صوفیا نے اس معنی کی ایک حدیث یہ ذکر کی ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرمایا کہ ''لِي مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِي فِيهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ'' (میرا میرے مالک سے خصوصی وقت ہے، جس میں نہ کسی نبی مرسل کی کوئی گنجائش ہے، نہ ہی کسی فرشتے کی۔

مگر علامہ سخاوی، علامہ عجلونی رحمہما اللہ وغیرہ نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث صوفیا ذکر کرتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ اوپر پیش کردہ حدیث کا مفہوم و معنی ہو۔

(المقاصد الحسنة:۵۶۵، کشف الخفاء:۲/۱۷۳)

الحاصل ایک عالم کو بھی چاہیے کہ وہ خود کو خلوتوں میں رکھ کر اپنے اندر ذکر کی قوت و طاقت پیدا کرے۔

الغرض یہ مجاہدات کا بیان تھا اور جب یہ مجاہدات ہوں گے تو روح کو ترقی ہوگی اور جسم و جسمانیات کے تقاضے کم ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ان مجاہدات کی وجہ سے اللہ ہدایت کے راستے بتائیں گے۔

اللہ مجھے بھی اور آپ کو بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے. آمین و آخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين.
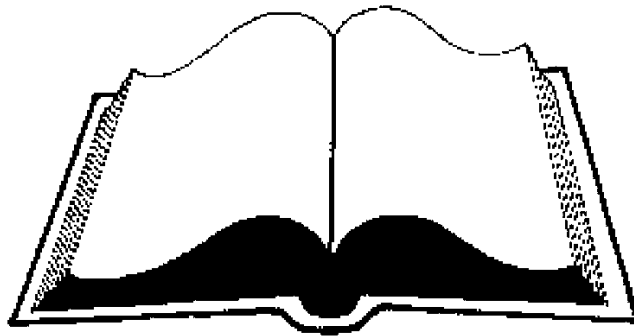
رہ گئی رسمِ اذاں!

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز، دوا کھاتے ہیں

(امجد حیدرآبادی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رہ گئی رسمِ اذاں!

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد:

قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم : يُوشِكُ أن يأتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لاَ يَبْقىٰ مِنَ الإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ ، وَلَا يَبْقىٰ مِنَ القُرآنِ إِلَّا رَسْمُه...الخ

(شعب الإيمان:١٧٦٣،مشكاة المصابيح:٣٨،السنن الواردة في الفتن:٢٣٦)

حضرات!

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سوسال قبل ہی آنے والے زمانوں کے احوال اس طرح بتادیئے ہیں کہ گویا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور آپ نے آئندہ پیش آنے والے، جو بھی احوال بتائے، وہ پیش آتے جارہے ہیں، لوگ ان احوال کا مشاہدہ کررہے ہیں۔

اس وقت آپ کے سامنے ایک لمبی حدیث کا چھوٹا سا ٹکڑا پیش کیا گیا ہے، جس میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے اعتبار سے بعد کے زمانے میں پیش آنے والی ایک حالت کا ذکر فرمایا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا، جس میں اسلام کا صرف نام رہ جائے گا اور قرآن کے صرف حروف ونقوش رہ جائیں گے۔

بہت ہی اہم مضمون اس حدیثِ پاک میں بیان کیا گیا ہے، ہمیں اور آپ کو اپنے احوال پر انطباق کرتے ہوئے اس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے؛ اس لیے کہ ایسا لگ رہا ہے کہ ہم سب لوگ اسی طرح کے احوال اور کیفیات سے گزر رہے ہیں کہ اس زمانے میں اسلام کا نام تو ہے؛ مگر اس کی حقیقت مفقود ہے اور حقیقت اسلام سے مراد اسلام کے عمال ہیں، اسلام کی عبادتیں مراد ہیں، اسلام کے احکامات مراد ہیں، اسلام میں بتائے گئے حقوق مراد ہیں، دیگر مختلف امور مراد ہیں، نماز اسلام ہے، روزہ اسلام ہے، حج وزکاۃ اسلام ہے، تلاوت اسلام ہے؛ مگر ان کے صرف نام نام تو ہمارے پاس رہ گئے اور حقیقت غائب ہوگئی۔

شان دار مساجد تعمیر کی جا رہی ہیں، مگر ویران ہیں ،اسی طرح قرآنِ کریم بہترین انداز سے طبع کیا جارہا ہے، قرآن کے اعلی ترین نسخے چھاپے جارہے ہیں، بڑے حسن کے ساتھ، بڑی زیبائش کے ساتھ، عمدہ سے عمدہ کاغذ پر قرآنِ کریم چھاپا جارہا ہے اور لوگ بڑی خوش دلی کے ساتھ اپنی الماریوں میں سجا رہے ہیں، شوکیس کی زینت بنارہے ہیں؛ لیکن یہ خریدنے والے لوگ، طبع کرنے والے لوگ قرآن کتنا پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کتنا کرتے ہیں؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال رَحِمَہُ اللہُ نے اپنے ایک شعر میں اسی حالت کا نقشہ کھینچا ہے:

رہ گئی رسمِ اذاں ، روحِ بلالی نہ رہی

فلسفہ رہ گیا ، تلقینِ غزالی نہ رہی

اذان ہورہی ہے، نماز ہورہی ہے، ذکر ہورہا ہے، تلاوت ہورہی ہے، مدرسے بنائے جارہے ہیں، اس میں تعلیم کا نظام جاری ہے، بخاری شریف کا درس ہورہا ہے، مختلف علوم وفنون پڑھائے جارہے ہیں، تحقیقات ہورہی ہیں، سب کچھ موجود ہے؛ لیکن

ایسا لگتا ہے کہ سب چیزیں نام نام کی رہ گئی ہیں، ان کے اندر سے روح غائب ہے۔

آج نماز ہے، نماز کی روح نہیں

نماز کتنی عظیم ترین عبادت ہے؛ مگر نماز کا حاصل اس زمانے میں کیا ہے؟ علامہ اقبال نے آج کی نمازوں کا بھی نقشہ کھینچا ہے:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

اقبال صاحب کے پہلے مصرعے کی تشریح دوسرے مصرعے میں کر رہے ہیں، پہلے مصرعے میں انھوں نے کہا کہ نمازی نہیں ہیں، اس پر اشکال ہو گیا کہ اقبال صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں؛ اس لیے کہ مسجدوں میں تو نمازی ہیں، بنگلور میں دیکھیے مساجد میں نمازی ہیں، دہلی کی جامعِ مسجد میں دیکھیے نمازی ہیں اور بھی بے شمار مساجد دیکھیے نمازی نظر آ رہے ہیں، اقبال صاحب دوسرے مصرعے میں اسی اشکال کا جواب دے رہے اور کہہ رہے ہیں کہ میری مراد کو بھی سمجھو، میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ نمازی نہیں ہیں؛ بل کہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ''وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے'' ہاں! اُٹھک بیٹھک کرنے والے بہت ہیں؛ لیکن وہ نمازی کتنے ہیں، جن کا دل نماز میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہے؟ کتنے نمازی ہیں، جن کی نماز میں نماز کی روح پائی جارہی ہے؟ کتنے نمازیوں کی نماز میں خشوع ہے، خضوع ہے، سنتوں کا اہتمام ہے، باریکیوں کا لحاظ ہے، واجبات کا خیال ہے، خلوص وللّٰہیت ہے؟ کتنے نمازی ہیں، جن کی نماز واقعی نماز ہے؟ جب آپ ایسے نمازیوں کو تلاش کریں گے؛ تو کتنے ملیں گے؟

نمازی نہ ہونے سے اقبال صاحب کی یہ مراد ہے کہ ''صاحبِ اوصافِ حجازی'' نہیں ہیں اور ''صاحبِ اوصافِ حجازی'' سے مراد صحابہ ہیں، جی! صحابہ جیسی نماز

پڑھنے والے نہیں ہیں، بس آج تو سجدہ کرنے والے ہیں؛ لیکن سجدے کی روح غائب ہے، رکوع کرنے والے ہیں؛ مگر رکوع تعلق مع اللہ سے خالی ہے۔

آج کے لوگوں کے ایمان کا حال

آج ہماری نماز کا حال کیا بیان کریں؟! ایمان کا حال ہی برا ہے۔ ہم پڑھتے ہیں : '' آمنت باللّٰہ '' مگر ''آمنت باللّٰہ'' کی حقیقت کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں ''آمنت بالرسول ''؛ مگر ''آمنت بالرسول '' کی حقیقت کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں ''آمنت بالآخرۃ'' مگر ''آمنت بالآخرۃ'' کی حقیقت کیا ہے؟ آخرت پر یقین رکھنے والے کا کردار کیا ہوتا ؟ اس کے اعمال کیسے ہوتے ہیں؟ مان تو لیا کہ اللہ ہے، مان تو لیا کہ رسول ہے، مان تو لیا کہ آخرت ہے؛ مگر ان کو ماننے کے بعد، ان چیزوں کے یقین کے درجے کو پہنچنے کے بعد، جو احوال و کیفیات اور جو آثار مرتب ہونے چاہئیں، وہ معدوم ہیں، وہ آثار ایمان والوں میں نظر نہیں آتے۔

اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے ماننے نہ ماننے کو کیفیت کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہوتا ہے، ایک طالب علم استاذ کو 'استاذ' مانے گا، تو اس ماننے کی کیفیت واثر دیکھا جائے گا، ایک بیٹا باپ کو 'باپ' مانے گا، تو اس ماننے کے آثار بھی نمایاں ہوں گے اور ان ہی آثار پر ماننے نہ ماننے کا فیصلہ ہوگا، ایک بیٹا باپ کو 'باپ' مانتا ہے، تو اس کے احوال بہ نسبت اس بیٹے کے جو باپ کو 'باپ' ہی نہ مانے، مختلف ہوتے ہیں اور دونوں کی کیفیت جدا ہوتی ہے۔ باپ تسلیم کرنے والا بیٹا، استاذ تسلیم کرنے والا شاگرد؛ ان کی اطاعت کرے گا، ان کی عظمت کرے گا، ان کے حقوق ادا کرے گا اور جو بیٹا اور شاگرد باپ کو اور استاذ کو تسلیم نہیں کرنے والا ہوگا، وہ ان کے حقوق ادا نہیں کرے گا۔

اسی طرح بھائیو! ہم اللہ کو، رسول کو، آخرت کو، جنت کو، جہنم کو، کتابوں کو، فرشتوں کو مانتے ہیں، تو اس ماننے کی کیفیات الگ ہونی چاہئیں، ان لوگوں کے مقابلے میں جونہیں مانتے ہیں، کافر و بے دین ہیں؛ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ماننے والے کی بھی وہی کیفیت ہو، جو نہ ماننے والے کی ہوتی ہے، دونوں میں فرق تو ہونا چاہیے۔

صحابیِ رسول حارثہ بن مالک رضی اللہ عنہ کے ایمان کی کیفیت

ایک مرتبہ حارثہ بن مالک رضی اللہ عنہ کہیں جارہے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہیں سے گزر ہوا اور دونوں کی ملاقات ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے پوچھا: «كَيفَ أَصبَحتَ يَا حَارِثَةُ ؟» (اے حارثہ! تم نے صبح کیسے کی؟)

عربی زبان میں کسی کی خیر خیریت پوچھنے کا یہ ایک انداز ہوتا ہے، جب آپ نے خیریت معلوم کی، تو حضرت حارثہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''أصبحتُ مُؤمِناً حَقّاً.'' (یارسول اللہ! پوری سچائی کے ساتھ ایک مومن ہونے کی حالت میں صبح کیا ہوں۔)

اس میں انھوں نے مؤمن ہونے کا دعوی کیا کہ پوری سچائی کے ساتھ میں مومن ہوں، اس میں کوئی غلط بیانی نہیں ہے۔ اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: «انظُرْ مَا تَقُولُ؟ فَإِنّ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيقَةً ، و مَا حَقِيقَةُ إِيمَانِكَ؟'' (دیکھ لینا کہ کیا کہہ رہے ہو؛ کیوں کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، پھر تمھارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟)

اس پر ان صحابی نے جواب میں چند باتیں بتائیں، کہا:

" قَدْ عَزَفت نَفْسِيْ عَنِ الدُّنْيَا." (میرا نفس دنیا سے بیزار ہوگیا۔)

" وَ أَسْهَرْتُ لِذٰلِکَ لَيْلِيْ." (اور اسی وجہ سے میں رات جاگتا ہوں۔)

" وَ أَظْمَأْتُ نَهَارِيْ. "(اور دن میں روزہ رکھتا ہوں۔)

" وَ كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلٰى عَرْشِ رَبِّيْ بَارِزاً." (اور یوں محسوس کرتا ہوں گویا کہ میں اپنے رب کے عرش کا نظارہ کررہا ہوں۔)

" وَ كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلٰى أَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَزَاوَرُوْنَ فِيْهَا."(اور یوں محسوس کرتا ہوں، گویا کہ میں جنتیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی زیارت کر رہے ہیں۔)

" وَ كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلٰى أَهْلِ النَّارِ يَتَضَاغَوْنَ فِيْهَا." (اور یہ بھی محسوس کرتا ہوں گویا کہ میں جہنمیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ رو پلا رہے ہیں۔)

ان کی یہ حیرت انگیز باتیں سن کر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

«یا حارث! عَرَفْتَ ، فَالزِمْ !»

(اے حارث! تو نے حقیقت کو جان لیا؛ لہٰذا اس کو لازم پکڑ لے۔)

(المعجم الكبير للطبراني :٣٢٨٩،مسند بزار:٦٩٤٨،شعب الإيمان:١٠١٠٧، تعظیم قدر الصلاة:٧٩٦)

حضرات! اس حدیث اور واقعے میں بڑی عبرت ہے، غور کریں کہ ہر چیز کے لیے ایک لفظ بھی ہوتا ہے اور اس کی ایک حقیقت بھی ہوتی ہے، جیسے آپ کہیں ''گھر'' ایک لفظ ہے، اس کی ایک حقیقت ہے، آپ کہیں ''زید''، یہ ایک لفظ ہے اور ایک اس کا مسمی ہے، آپ نے کہا ''گھڑی'' یہ ایک لفظ ہے اور ایک اس کا معنی ہے، ہر چیز میں ایسا ہی ہے، لباس کہو، کھانا کہو، کچھ بھی کہو؛ یہ سب الفاظ ہیں اور ان سب کی بھی ایک ایک حقیقت ہے۔

لہٰذا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لفظ ''ایمان'' کی حقیقت کا ان صحابی سے سوال کیا کہ ''ایمان'' کے دعوے کی دلیل کیا؟

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: یارسول اللہ! میں نے ایمان کی جو حقیقت سمجھی ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان کی وجہ سے دنیا سے میرا نفس کنارہ کش و بے زار ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے رات بھر جاگتا ہوں، دن بھر روزہ رکھتا ہوں اور میرا حال یہ ہے کہ، گویا میں اپنی آنکھوں سے اپنے پروردگار کا عرش دیکھ رہا ہوں اور میرا حال یہ ہے کہ گویا میں اپنی آنکھوں سے اہلِ جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپس میں مل رہے ہیں، ایک دوسرے کی زیارت کر رہے ہیں اور میرا حال یہ ہے کہ گویا میں اپنی ان آنکھوں سے جہنمیوں کو دیکھ رہا ہوں، کہ وہ عذاب میں گرفتار ہیں۔

اس جواب کو سن کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حارثہ! تو نے ''ایمان'' کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے، اس کو لازم پکڑ لینا (تین دفعہ یہ فرمایا) ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ یہ وہ بندہ ہے، جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے نور سے منور کر دیا ہے۔

اس کے اندر کچھ کیفیات کا بیان آیا ہے، ایمان والے کے کچھ احوال کا بیان آیا ہے، جس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایک مؤمن کے احوال ایمان کی وجہ سے کیا ہوتے ہیں؟ کیا کیفیات ہوتی ہیں؟ ایمان والوں سے ایسی ہی کیفیات مطلوب ہیں، آج ہمارے ایمانوں کا بھی جائزہ لیں، جس کے اندر کوئی حال ہی نہیں ہے۔

حارثہ بن مالک رضی اللہ عنہ کا مقام

حارثہ بن مالک رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا، جب ان کا

انتقال ہوا، تدفین ہونے کے بعد ان کی والدہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں آئیں اور کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! حارثہ کے انتقال کا تو مجھے کوئی غم نہیں؛ البتہ مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ ان کا حال کیا ہے؟ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا میرا بیٹا جنت میں ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ حارثہ جنت میں نہیں؛ بل کہ جنتوں میں ہے اور اللہ نے ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائی ہے۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کی والدہ مسکراتے ہوئے واپس ہو رہی تھیں۔

(شعب الإيمان:١٠١٠٦)

یہ قصہ حارث بن مالک رضی اللہ عنہ کا ہے یا حارثہ بن نعمان کا، روایات اس باب میں مختلف ہیں۔

بہ ہر حال غور کا موقع ہے، کہ کیا ایمان تھا ان حضرات کا! ایک طرف حارثہ رضی اللہ عنہ کے ایمان کی کیفیت بھی دیکھیے اور اس کی وجہ سے ان کے مقام کا بھی اندازہ کیجیے اور دوسری طرف ان کی والدہ کے ایمان کی حالت بھی دیکھیے کہ ابھی دفن کر کے آئے ہیں اور پوچھتی ہیں کہ ان کے انتقال کا غم نہیں، مجھے ان کا اخروی حال بتا دیجیے۔

ان کی والدہ کا آخرت سے متعلق سوال بھی تو ایمان کامل ہونے کی وجہ سے ہے؛ ورنہ تو لوگ روتے ہیں اور اس لیے روتے ہیں کہ مرنے والے کا بیڈ خالی نظر آتا ہے، یہ کہہ کر روتے ہیں کہ ہمارے ابا جی آج ہمارے ساتھ دستر خوان پر موجود نہیں ہیں اور کبھی یہ کہہ کر روتے ہیں کہ ہمارے ابا جی دکان کی اسی کرسی پر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ سب تو یاد ہے، اس کی فکر ہے؛ لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی کہ وہاں مرنے کے بعد کی زندگی میں ان کا کیا حال ہوگا؟ اس سے ہمارے ایمانوں کی حالت کا پتہ چلتا ہے کے کیا حال ہے؟ سب مان رہے ہیں اللہ کو، رسول کو، آخرت کو؛ لیکن ماننے کا حال یہ ہے کہ اس میں کوئی حال ہی نہیں ہے، بے حال ہیں۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے ایمان کا حال

عمیر بن حُمام رضی اللہ عنہ: ایک انصاری صحابی کا واقعہ لکھا ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر وہ شریکِ جنگ تھے اور ان کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی، جس میں کچھ کھجوریں تھیں، وہ اس شاخ میں سے کھجوریں کھا رہے تھے، پھر اچانک کہنے لگے کہ اگر میں اس کو کھانے تک زندہ رہوں، تو یہ بہت لمبی زندگی ہو جائے گی، یعنی اس کو کھاتے رہنے سے تاخیر ہو جائے گی، اس سے پہلے میں جنت میں جانا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ شاخ وہیں ڈال دی اور جا کر جنگ میں شہید ہو گئے۔

(صحیح مسلم:۵۰۲۴،مسند أحمد:۱۲۴۲۱،سنن البیھقي:۱۸۳۷۳،المستدرک:۵۷۹۸)

بزرگو! غور فرمایئے کہ یہ کیا ہے؟ ایمان کی ایک حالت، ایک کیفیت ہے، جو یقینِ کامل کے مراتب پا گئی ہے۔

حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کے ایمان کی حالت

یہاں یاد آیا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ایک خلیفہ تھے، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ ، اکابر علما میں سے تھے، علم بھی بہت اونچے درجے کا تھا، تقوے کے اعتبار سے بھی اونچے مقام پر تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی مجلس ہو رہی تھی، اسی دوران حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کا خط ڈاک سے آیا اور حضرت تھانوی کے سامنے پیش کیا گیا، اس خط میں حضرت پھولپوری نے اپنے کچھ احوال لکھے تھے، حضرت تھانوی نے اس خط کو پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ احوال تو دوسروں کو سنانے کے لائق ہیں، پھر حضرت نے اس خط میں لکھے ہوئے احوال پڑھ کر سنائے، اس خط میں ایک جملہ یہ بھی تھا:

''حضرت ! آپ کی برکت سے میرا اس وقت یہ حال ہے کہ میں دنیا کی اس زمین پر چلتا ہوں، تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ آخرت کی زمین پر چل رہا ہوں۔''

اس کے بعد حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا کہ میں نے اس کا جواب بھی لکھا ہے، وہ بھی سنا دیتا ہوں، پھر حضرت نے اس جواب کو سب کے سامنے سنایا:

''یہ کیفیت جو آپ پر طاری ہے، یہ صدیقین کی کیفیت ہے۔''

''صدیق'' مبالغے کا صیغہ ہے، اس کے معنے بے پناہ سچائی کے ساتھ ایمان رکھنے والا، نبی کے بعد ''صدیق'' کا ہی درجہ ہے۔

ایمان جب کمال کو پہنچتا ہے، تو یہی حال انسان کا ہو جاتا ہے، کہ وہ ایمان والی باتوں کو گویا اپنی آنکھوں دیکھتا ہے؛ اس لیے اسے آخرت پر یقین ہے، تو آخرت کے سلسلے میں متفکر رہتا ہے اور لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اگر نہ ادا کروں، تو پکڑ ہوگی، اس پکڑ کا اسے استحضار ہوتا ہے، گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کے ایمان کی حالت

حضرت مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کے والد کی یکے بعد دیگرے چار بیویاں ہوئیں؛ لیکن انھوں نے شرعی قاعدے سے ان کا مہر نہیں دیا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ معافی ہوئی تھی یا نہیں؟ لہٰذا ان کے انتقال کے بہت بعد ایک بار حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کو اس کا احساس ہوا اور سوچا کہ میرے والد نے بیویوں کا مہر ادا نہیں کیا اور ان کی جائیداد تقسیم ہو کر میرے بھی حصے میں آ گئی ہے، تو اس میں ان بیویوں کا حق بھی مل گیا ہے؛ لہٰذا اس کی تحقیق کر کے ان کے وارثین تک اس کو پہنچا دینا چاہیے۔

لہٰذا آپ نے علما سے فتوی لیا، تو اکثر نے جواب دیا کہ آپ پر اس کی ادائیگی لازم نہیں؛ مگر آپ نے احتیاط اسی میں سمجھی کہ جو والد کا ترکہ میرے حصے میں آیا ہے، اس کے تناسب سے والد کی بیویوں کے وارثین کو مہر کا حصہ ادا کروں؛ اس لیے آپ نے والد کی بیویوں کے وارثین کون کون ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ اس کی تحقیق کرائی اور سب کو ان ان کا حصہ پہنچایا، حتی کہ بعض کا حصہ ایک دو آنے نکلا تھا؛ مگر آپ نے اس کو ادا کرنے سفر کیا اور اپنا روپیہ خرچ کیا اور ان تک اس کو ادا کیا۔ اس کی تفصیل ''اشرف السوانح'' میں دیکھ سکتے ہیں۔ (اشرف السوانح:۳/۳۵۲-۳۵۳)

اس کو کہتے ہیں آخرت پر ایمان؛ مگر آج کا دور تو دھاندلیا کرنے کا ہے، دھوکا دہی کا ہے، خود ہی سب کچھ ہڑپ کر جانے کا ہے، پھر بھی کہتے ہیں: اللہ ہے، پھر بھی کہتے ہیں: رسول ہے، پھر بھی کہتے ہیں: آخرت ہے، پھر بھی کہتے ہیں: حساب وکتاب ہے، پھر بھی کہتے ہیں: جنت ہے، دوزخ ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان سب کو ماننے والا دھوکے باز ہو، غاصب ہو، اتنی بڑی بڑی چیزوں کو ماننے والا ایسی گھٹیا حرکتیں کیسے کرسکتا ہے؟

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا مقام اور ان کی مقبولیت

حضرت امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، سارے عالم کے رہنما تھے، امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ تھے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا مقام عطا کیا تھا، ہر آدمی ان کا احترام کرتا تھا، ہر آدمی کے دل میں ان کی محبت تھی، ہر آدمی ان سے عقیدت رکھتا تھا۔

ان کی شروع کی زندگی کچھ عجیب تھی، جوانی میں، لہو ولعب میں، تماشوں میں، عشق ومعاشقے میں لگے ہوئے تھے؛ لیکن اس کے بعد کچھ واقعات ان کے سامنے

ایسے پیش آئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کا رخ ہی موڑ دیا اور وہ دین کی طرف آئے؛ تو ایسے آئے کہ سارے عالم کے رہنما بن گئے، پہلے تو خود ہی راہ پر نہیں تھے؛ لیکن جب راہ پر آئے، تو لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے رہبر بن گئے، آج بھی ان کا نام بڑی عزت کے ساتھ، بڑی عقیدت کے ساتھ، بڑی محبت کے ساتھ، بڑی عظمت کے ساتھ لیا جاتا ہے، آپ حدیث کے راوی بھی ہیں، بڑے بڑے اکابرین ان کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔

ان کی مقبولیت کا ایک واقعہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ شہر ''رے'' گئے، جہاں ہارون الرشید کا پایہ تخت تھا، ہارون الرشید کا پایۂ تخت ''رے'' میں تھا اور وہی امام محمد رحمۃ اللہ کا وطن بھی ہے (جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے شاگرد ہیں) اور امام ابن المبارک رحمۃ اللہ کسی دوسری بستی سے وہاں آئے، جب لوگوں کو اطلاع ہوئی کہ امام ابن المبارک ہمارے شہر ''رے'' تشریف لا رہے ہیں اور فلاں جگہ تک پہنچ چکے ہیں، تو ان کے اعزاز کے لیے، ان کے استقبال کے لیے پورا شہر ٹوٹ پڑا، سب لوگ بھاگے چلے جا رہے تھے۔

ہارون الرشید اپنے محل کے بالا خانے پر کھڑے ہوئے کچھ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے، جب دیکھا کہ لوگ بے تحاشہ بھاگتے چلے جا رہے ہیں، تو وہ سوچنے لگے کہ آخر کیا بات ہوگئی کہ ہمارے شہر کے اندر لوگ اس طرح بھاگتے کیوں چلے جا رہے ہیں؟ اس لیے فوراً آدمی بھیجا کہ جاؤ اور معلوم کر کے آؤ کہ کیا ہوا ہے؟ وہ آدمی گیا اور جا کر معلوم کیا، لوگوں نے کہا کہ عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ ہمارے شہر آرہے ہیں، ان کے استقبال میں یہ لوگ یوں جا رہے ہیں، خیر وہ خادم اوپر آیا، ہارون الرشید ادھر بیٹھے ہوئے تھے، ان کی بیوی: ملکہ زبیدہ اُدھر بیٹھی ہوئی تھی، وہ خادم کہنے

لگا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے، بس اتنی بات ہوئی ہے کہ عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ ہمارے شہر تشریف لا رہے ہیں، لوگ ان کا نام سن کر ان کے استقبال کے لیے یوں بھاگے چلے جا رہے ہیں، یہ کہہ کر وہ خادم تو چلا گیا، ہارون الرشید کی بیوی ان کو دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی کہ ایک آپ کی حکومت ہے کہ جب آپ کہیں جائیں، تو جب تک کوئی پولیس والے ''ہٹو بچو، ہٹو بچو'' نہ کہیں، کوئی آپ کو راستہ دینے والا نہیں؛ لیکن ایک یہ لوگ ہیں، جب یہ آتے ہیں؛ تو پوری دنیا ان کی ہو جاتی ہے، کہنے لگی کہ اصل حکومت تو ان کی ہے آپ کی کیا ہے؟ واقعی یہ ایسے عجیب وغریب لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا مقام ان کو دیا۔

عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کا ایمان

میں ان امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کا ایمان افروز واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کے ایک شاگرد تھے، جن کا نام عبدالرحمٰن بن القاسم رحمہ اللہ تھا، وہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں ہمیشہ ایک بات کھٹکتی تھی، میں سوچتا تھا کہ عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کا جو مقام ومرتبہ میں اس وقت دنیا میں دیکھ رہا ہوں، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اتنا بڑا مقام ان کو کیوں اور کیسے مل گیا؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کے اندر عجیب وغریب مقبولیت عطا کر دی ہے اور حیرت کن انداز سے دنیا کے اندر ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دماغ میں یہ باتیں چلتی رہتی تھیں، میں یہ سوچا کرتا تھا۔

اسی دوران ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کے ساتھ مجھے ایک سفر درپیش ہوا، سفر میں مَیں بھی ساتھ تھا اور دوسرے بھی بہت سارے لوگ تھے، چلتے چلتے ایک جگہ رات کا وقت ہوا، تو وہاں قیام کے لیے ایک مکان کا نظم کیا گیا،

چراغ جلایا گیا اور کھانے کے لیے دستر خوان بچھایا گیا، سب لوگ کھانے بیٹھ گئے اور چراغ کے بالکل سامنے عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے تھے، کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک ہوا کا ایک تیز سا جھونکا آیا اور چراغ گل کر گیا؛ لیکن اُس زمانے میں یہ ماچس واچس نہیں تھا کہ جیب سے نکالا اور جلا دیا، لائٹر کا تو کیا سوال؟ الغرض حضرت عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ بھائی اس کو ذرا باہر جا کر کسی اور چراغ سے جلا کر لے آؤ، چناں چہ میں اس چراغ کو جلانے باہر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد میں چراغ جلا کر لے آیا، تو عبداللہ بن مبارک سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے، چراغ کو رکھ کر میں نے ان کو دیکھا، تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہے، وہ رو رہے ہیں اور دیگر لوگ سب اپنے کاموں میں ہیں، کچھ باتوں میں ہیں، کچھ لوگ کسی اور چیز میں ہیں؛ لیکن اس اندھیری فضا میں بیٹھ کر عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ رو رہے ہیں، چراغ آیا، تو ان کے رونے کا پتہ چلا، چراغ نہ آتا، تو کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ حضرت آخر کیا بات ہوئی کہ آپ رو رہے ہیں؟ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا جواب یہ تھا کہ جب یہ چراغ گل ہو گیا اور اندھیری چھا گئی، تو قبر کی اندھیری یاد آ گئی؛ اس لیے رونا آ گیا۔

اللہ اکبر! ان کے وہ شاگرد کہتے ہیں کہ اتنے دنوں سے میرے دماغ کو خراب کرنے والا جو مسئلہ تھا، آج وہ مسئلہ حل ہو گیا، جو میں سوچا کرتا تھا کہ ان کا اتنا بڑا مقام کیوں ہے؟ آج سمجھ میں آ گیا۔

مجھے ایک بزرگ کی بات یاد آ گئی، انھوں نے فرمایا کہ رات کی تنہائیوں میں اور خلوتوں میں کہیں گھس گھس کر دس کمروں کے اندر کوئی اللہ کا بندہ اپنے اللہ کو یاد کرنے کے لیے عبادت میں، ریاضت میں، ذکر میں، تسبیح میں، مناجات میں، رونے میں، دعا میں، خوف میں، خشیت میں رہتا ہے، تو اس کی خوشبو سارے عالم میں پھیلا دی

جاتی ہے۔

الغرض میں ان واقعات سے آپ کے سامنے ایمان والوں کے نمونے رکھ رہا ہوں کہ ہم سوچیں، غوروفکر کریں کہ ہمارے اندر کون سا نمونہ ہے؟ ماننے والوں کا ایک نمونہ ہوتا ہے، نہیں ماننے والوں کا ایک نمونہ ہوتا ہے؛ نہیں ماننے والوں کا نمونہ ہمارے اندر پایا جارہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ایمان میں کمزوری ہے، نام کا ایمان رہ گیا ہے، نام کا جنت کا تصور رہ گیا ہے، نام کا دوزخ کا خیال رہ گیا ہے، حقیقت میں یہ چیزیں جب دل کے اوپر مستولی ہوجاتی ہیں، تو اس کے بعد انسان کی حالت کے اندر فرق آنا ضروری ہے۔

کمزور ایمان والوں کے لیے سامانِ تسلی

ہمارے اسلاف واکابر کے اعلیٰ درجے کے ایمان افروز واقعات اس لیے بیان کیے گئے ہیں، کہ ان کو سن کر ہم بھی اپنے اندر ایسا ہی ایمان پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ارادہ کریں، اس کے لیے محنت کریں؛ مگر ان واقعات کو سن کر کوئی مایوس نہ ہو، کہ ہم ایسا ایمان پیدا نہیں کر سکتے، ہم کمزور ہیں؛ کیوں کہ مایوسی تو کفر ہے۔

ہم جیسے کمزوروں کے لیے بھی سہارا ہے، ہم جیسے کمزوروں کے لیے بھی تسلی اور تشفی بھی ہے۔

بخاری میں ایک طویل حدیث آئی ہے، جس کا خلاصہ آپ کو سناتا ہوں:

"اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن کچھ نیک بندوں کی سفارش اور شفاعت کے نتیجے میں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش کے نتیجے میں جہنم سے ایمان والوں کو نکالیں گے، آخر میں فرمائیں گے کہ جس کے دل کے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو، اس کو بھی

اس جہنم سے نکال لاؤ۔ چناں چہ جن کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا، ان تمام لوگوں کو بھی جہنم سے نکال دیا جائے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب میرا حق ہے، میری سفارش باقی ہے، میں کچھ لوگوں کو نکالوں گا، پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے کچھ ایسے لوگوں کو نکالیں گے، جو جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے۔

(البخاري:۴۷۳۹،مسلم:۴۷۲)

قیامت میں حافظوں نے درخواست وسفارش کی، اللہ نے ان کی وجہ سے کچھ لوگوں کو جہنم سے نکالا، عالموں نے اللہ کے سامنے سفارش کی، اللہ نے عالموں کی سن کر کچھ لوگوں کو نکالا اور کچھ اللہ کے ولی اور بزرگ اور اللہ کے مقرب تھے، ان کی سفارش اللہ نے سنی اور کچھ لوگوں کو جہنم سے نکال ڈالا، پھر انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام: حضرت آدم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم اور دیگر پیغمبر اپنے اپنے لوگوں کے حق میں سفارش کریں گے اور ان کی سفارش کے نتیجے میں اللہ لوگوں کو نکالیں گے اور پھر آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش ہوگی، آپ کی سفارش کے نتیجے میں بے شمار جہنمیوں کو نکالا جائے گا؛ حتی کہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا، ان سب کو بھی ان سفارشوں کے نتیجے میں نکال دیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد جہنم میں کوئی ایمان والا باقی نہیں ہوگا، یہی تو سمجھ میں آرہا ہے؛ لیکن اس حدیث میں آگے ہے کہ اللہ فرمائیں گے کہ اب میرا نمبر ہے، میں نکالوں گا، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک بڑی مخلوق کو جہنم سے نکالیں گے اور جنت میں بھیج دیں گے۔

اللہ جہنم سے جن کو نکالیں گے، وہ کون ہوں گے؟

یہ بڑی مشکل حدیث ہے؛ اس لیے مشکل ہے کہ حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ جس کے دل کے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے، اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے نکال دیا جائے گا، تو اب کوئی ایمان والا اس میں باقی نہ ہوگا، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ جن کو نکالیں گے، وہ کون ہوں گے؟

اگر آپ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہیں، تو یہ صحیح نہیں؛ اس لیے کہ کافر کو جہنم سے نکالا نہیں جائے گا اور جنت میں اس کے داخلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے؛ اس لیے کہ کوئی کافر جنت میں نہیں جائے گا، وہ جنت سے بالکل محروم ہے، تو اس لیے اللہ تعالیٰ کافروں کو تو نہیں نکالیں گے، یہ بڑا مشکل سوال ہے۔

ایک زمانے میں حضرت مولانا شیخ الحدیث زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ جنھوں نے "ابوداود شریف" کی عربی میں شرح لکھی، جس کا نام ہے "**بذل المجهود في حل سنن أبي داود**" ان کو بھی یہ اشکال پیش آیا تھا، جب ان کو اشکال پیش آیا، تو انھوں نے اپنے شیخ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کو خط لکھا کہ حضرت! اس حدیث کے بارے میں مجھے یہ اشکال ہو رہا ہے، اس کا کیا جواب ہے؟ یہ کونسی مخلوق ہے؟ جس کو اللہ تعالیٰ نکالیں گے۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی تحقیق

اس کے جواب میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ اس حدیث کے اندر جس کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھوں سے ان کو نکالے گا اور جنت

میں بھیج دے گا، یہ وہ لوگ ہوں گے، جن کے پاس نام کا اسلام ہوگا، حقیقت میں اسلام نہیں ہوگا۔

اللہ کا فضل ہے کہ ہم ایسے اب بھی نہیں ہیں، ایک زمانہ اور ایسا آئے گا بعد میں قیامت کے قریب کہ ایسے لوگ بھی آجائیں گے۔ چناں چہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے حوالہ دیا ہے کہ "ابن ماجہ" کے اندر ایک حدیث ہے: حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی، اس کے اندر یہ مضمون آیا ہے، جو "کتاب الفتن" میں ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس زمانے میں لوگ صرف اسلام کے نام سے واقف ہوں گے، وہ اپنے آپ سے کہیں گے کہ ہم مسلمان ہیں؛ لیکن انھیں خبر نہ ہوگی کہ اللہ کون ہے؟ انہیں معلوم نہ ہوگا کہ رسول کیا ہے؟ نہ اللہ کو جانیں گے، نہ رسول کو جانیں گے، نہ دین کو جانیں گے، نہ نماز کو جانیں گے، کسی چیز کو نہیں جانیں گے؛ لیکن وہ کہیں گے کہ ہم مسلمان ہیں۔

(سنن ابن ماجہ:۴۰۴۹)

حضرت کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ اللہ ان کو جہنم سے نکالے گا۔

"مَانِعَةُ الْجمع" ہے؛ "مَانِعَةُ الْخُلُو" نہیں

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس موقع پر ایک لطیف بات فرمائی، جو علما کے کام کی ہے، عوام تو نہیں سمجھ سکتے، جو لوگ منطق پڑھے ہوئے ہیں، وہ سمجھ سکیں گے۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایمان اور کفر کے درمیان "مانعة الجمع"، ہے "مانعة الخلو" نہیں: "مانعة الجمع" یہ ہوتا ہے کہ دو ایسی چیزیں ہیں کہ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں ہے، جیسے رات اور دن، رات اور دن ایک ہی

وقت جمع نہیں ہوسکتے؛ کیوں کہ رات اور دن کے اندر ''مانعة الجمع '' ہے یعنی دونوں جمع نہیں ہوسکتے، ان دونوں کا جمع ہونا منع ہے، ممنوع ہے، ناجائز ہے، ہو ہی نہیں سکتا، اسی طرح ایک ہی آدمی ایک ہی وقت میں کالا بھی ہو گورا بھی ہو؛ ہوسکتا ہے؟ نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح کچھ چیزیں ہوتی ہیں کہ دونوں کا جمع ہونا ممکن نہیں ہوتا، جیسے ایمان اور کفر ایک ہی دل میں جمع ہو جائیں، یہ ناممکن ہے، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک ہی آدمی ایک ہی وقت میں کافر بھی ہو اور مؤمن بھی ہو، اس کے دل میں ایمان بھی ہو اس کے دل میں کفر بھی ہو، نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ کفر اور ایمان میں ''مانعة الجمع '' ہے، لیکن ''مانعة الخلو '' نہیں ہے، کیا مطلب؟ یعنی ایک دل ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جس میں دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہو، نہ کفر ہو اور نہ ایمان ہو، کوئی دل ایسا بھی ہوسکتا ہے، جو دونوں سے خالی ہو، دونوں سے خالی ہونا ممنوع نہیں ہے، مثلاً: ایک آدمی ہے، اس کے دل میں ایمان بھی نہیں ہے، اس کے دل میں کفر بھی نہیں ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ ایسی ایک مخلوق ہوگی، جس کے دل میں نہ ایمان ہوگا، نہ کفر ہوگا، اللہ اخیر میں ان کو نکال کر جنت میں بھیج دیں گے، یہ ہے وہ مخلوق۔

خلاصہ

بہ ہر حال میں نے آپ کو توجہ دلانی چاہی کہ ہمارے ایمان کا جائزہ، اس کی کیفیت کا جائزہ، ہماری نمازوں کا جائزہ اور روزوں کا، عبادتوں کا، ان سب کا جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ ان سب چیزوں کی حقیقت ہمارے پاس پائی جارہی ہے یا نہیں پائی جارہی ہے؟ صرف نام نام کے ہم رہ گئے ہیں، یا یہ کہ اس کا کام اور اس کی حقیقت بھی پائی جارہی ہے کہ نہیں پائی جارہی ہے اور ایسا تو نہیں جیسا کہ علامہ اقبال

نے کہہ دیا ؂

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

''روحِ بلالی'' پیدا کرو، نمازوں کے اندر وہ روحانی کیفیات حاضر کرو، وہ رونا وہ دھونا، وہ اللہ سے تعلق اور تعلق مع اللہ کی کیفیات اور حالتیں، یہ سب چیزیں طاری ہوجائیں، جاری ہوجائیں، ساری ہوجائیں، ایسی کیفیات اور حالات اگر پیدا ہوں، تو ایمان میں کمال پیدا ہوتا ہے اور ایمان کا کمال مطلوب عندالشرع بھی ہے اور محمود بھی ہے، اس کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، اس کے بارے میں ترغیب دی گئی ہے کہ اپنے ایمانوں کو کامل بناؤ؛ اس لیے کہ ایمان کامل، کامل نجات دلاتا ہے اور ایمانِ ناقص، ناقص نجات دلاتا ہے۔

جب ایمانِ کامل ہوگا، تو ڈائرکٹ آدمی جنت میں پہنچ جائے گا؛ لیکن اگر ایمان ناقص ہوگا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نجات بھی ناقص ملے گی، یعنی پہلے تو سیر کرنی پڑے گی جہنم کی، پھر وہاں سے ذرا پاک وصاف ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ وہاں سے نکالیں گے اور پھر جنت کے اندر داخل فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

نعمت اور مصیبت

- کب ملتی ہے؟
- کیسے ملتی؟
- کیوں ملتی ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعمت اور مصیبت

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد :
فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم .
﴿ أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ، الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ.﴾ (یونس :٦١-٦٢) صدق اللہ العظیم !

اس وقت دنیا کے جو حالات ہیں، دنیا میں جو مسائل چل رہے ہیں، ان چیزوں پر نظر کرتے ہوئے، جب آدمی غور وفکر سے کام لیتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ہے، بڑے حالات ہیں، بڑے مصائب ہیں اور ان مصائب میں روز بہ روز اضافہ بھی ہوتا جارہا ہے اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ظلم ہے، زیادتی ہے، اس کا نشانہ مسلمان ہی بنتے جارہے ہیں، دنیا میں بہت سے مذاہب کے ماننے والے ہیں، بہت سی قومیں ہیں؛ لیکن حالات اور مسائل مسلمانوں کے حق میں زیادہ ہیں، غیروں کے حق میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو حالات ہی نہیں ہیں یا نہیں، تو کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔

جو ممالک، ''اسلامی ممالک'' کہلاتے ہیں، ان کی حالت بھی ابتر ہے، وہاں بھی ظلم ہے، زیادتی ہے، مسلمانوں کے حق میں اور جو اسلامی ممالک نہیں ہیں، وہاں بھی جو حالات پیش آرہے ہیں، تو وہاں بھی مسلمان ہی اس کی زد میں آتے ہیں اور مسلمان ہی اس کا شکار ہو رہے ہیں، یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر آدمی کو کھلی آنکھوں نظر آرہا ہے۔

اخبارات میں، رسائل میں، جرائد میں اور مختلف ذرائعِ ابلاغ سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی جارہی ہے۔

اتنے سارے حالات، اتنے سارے مسائل، اس قدر مصائب، اس قدر طوفان؛ مسلمانوں کے خلاف سامنے آنے کے باوجود ہم لوگ اس بات پر غور کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہیں کہ ایسا ہے کیوں؟؟ اس کے اسباب کی کھوج لگائیں، اس کے علل اور اس کے بواعث پر روشنی ڈالیں، غور و فکر کریں کہ آخر مسلمانوں کی تباہی، مسلمانوں کی ذلت وخواری ورسوائی سب جگہ پر ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ اپنے کہلاتے ہیں یا اپنے ممالک کہلاتے ہیں، وہاں بھی یہی صورتِ حال پیش آرہی ہے، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے اوپر غور کرنے کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے۔

حالات کا جائزہ لینا بھی امت کی ذمے داری ہے

قرآن وحدیث میں ہمیں اس بات کی دعوت دی گئی ہے، کہ غور و فکر سے کام لیا جائے؛ جگہ جگہ قرآنِ کریم میں پچھلی قوموں کے واقعات اور حالات بیان کرنے کے بعد اللہ کی طرف سے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے؛ یہ اسی لیے ہے کہ ہم زمانے سے گذرتے ہوئے، حالات سے گذرتے ہوئے، مصائب سے گذرتے ہوئے کبھی

بے خبری کی زندگی نہ گذاریں؛ بل کہ اپنے آپ کو متیقظ رکھیں، بیدار رکھیں اور جب حالاتِ ناسازگار سامنے آئیں، تو اس وقت غور وفکر سے کام لینے کا اپنے اندر سلیقہ پیدا کریں؛ اس کے لیے ہمیں دعوتِ غور وفکر دی گئی؛ لیکن اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری امتِ مسلمہ بہ حیثیتِ مجموعی غور وفکر کی صلاحیت کے فقدان سے دوچار ہو رہی ہے، بہ حیثیتِ مجموعی تدبر و تفکر کی دولت سے محروم کردی گئی ہے، گویا کہ یہ چیز اُن سے سلب کرلی گئی ہے، چھین لی گئی ہے، دور دور تک، دور دور تک کوئی بھی اس سلسلے میں نام و نشان نظر نہیں آتا کہ بہ حیثیتِ مجموعی امتِ مسلمہ ان چیزوں پر غور وفکر کر رہی ہو اور اس کے لیے کوئی نتائج سامنے لا رہی ہو، اس کے لیے آگے بڑھ رہی ہو، اقدام کر رہی ہو۔

یہ صورت حال انتہائی گھمبیر، بہت ہی افسوس ناک اور نہایت ہی خطرناک ہے، ایک تو یہ ہے کہ مسائل پیش آرہے ہیں، ذلت ہو رہی ہے، رسوائی ہو رہی ہے، پسپائی ہو رہی ہے اور دوسری طرف یہ ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اس پر غور وفکر کرنے کے لیے امت تیار نہیں ہے۔ گویا کہ ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (النور: ۴۰) کا منظر نظر آرہا ہے اور قرآن نے اسی سلسلے میں جو فرمایا: ﴿إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا﴾ (النور: ۴۰) کہ اتنی اندھیری چھائی ہوئی ہے اور ظلمتوں پر ظلمتوں کی تہہ اس طرح بیٹھی ہوئی ہے، کہ اگر ہاتھ نکالیں، تو اپنا ہاتھ بھی نہ دیکھ پائیں کہ میرا ہاتھ موجود ہے یا نہیں، اسی طریقے پر آج امتِ مسلمہ ایک طرف تو رسوائی و پسپائی میں ہے اور دوسری طرف اس بات پر غور وفکر کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے کہ کیوں حالات ہیں؟ کیوں مسائل ہیں؟ آخر یہ ذلت و نکبت اور مصیبت و پریشانی ہمارے اوپر بار بار کیوں ڈالی جا رہی ہے؟ یہ بات ہے، جس پر غور وفکر کرنا امتِ مسلمہ کے اوپر فرض ہے، بہ حیثیتِ مجموعی بھی فرض ہے اور انفراداً بھی ہر آدمی کی

ذمے داری ہے کہ وہ غور وفکر کرے۔

قرآنِ کریم میں مختلف نہ ماننے والی قوموں کے حالات

قرآن وحدیث سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی اصول نہیں ہے، کوئی ضابطہ نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر ہمارے لیے تاریخ کا کوئی ذخیرہ بھی نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی احکام کا ذخیرہ بھی نہیں ہے، اس میں جب ہم غور وفکر سے کام لیں گے؛ تو کچھ باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

قرآن میں آپ دیکھیں، تو بہت سی قوموں کا تذکرہ ہے، بہت سی ملتوں کا تذکرہ ہے، بہت سے افراد کا ذکر بھی ہے، اسی طرح احادیث کے اندر بھی بہت سی قوموں اور ملتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان پر واقع ہونے والے حالات اور ان پر جاری ہونے والے مختلف قسم کے واقعات کا ذکر مفصلاً موجود ہے اور یہ قوموں کا تذکرہ اسی لیے تو کیا گیا ہے، کہ ہم غور وفکر سے کام لیں! اگر غور وفکر سے کام نہ لینا تھا، تو پھر اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں کے بیان کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ شعیب اور اس طرح کی بعض اور قوموں کا ذکر قرآن میں ہے، جنھوں نے حضراتِ انبیا علیہم السلام کی دعوتوں کا صریح طور پر انکار کر دیا تھا، تکذیب کر دی تھی، ماننے سے انکار کر دیا تھا، انبیا کی تعلیمات کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور حضراتِ انبیا علیہم السلام کا مذاق اڑایا کرتے تھے، انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کو اور ان کی طرف سے لائے ہوئے دین کو، ان کے پیغام کو، ایک جھوٹ اور بے ہودہ چیز سمجھ کر اس سے دوری اختیار کرتے تھے اور بھاگتے تھے، ایسی بہت ساری قومیں ہیں، جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی پر پتھر برسا کر انھیں ہلاک کیا، کسی کو ایک زوردار چیخ سے ہلاک کیا، کسی کو زمین میں

دھنسا کر ہلاک کیا۔

قرآن کریم میں بعض ماننے والوں کے حالات

قرآنِ کریم میں کچھ ایسی قوموں کا بھی ذکر ہے، جو ماننے والی قومیں ہیں: جیسے بنی اسرائیل؛ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کو اور بہت سارے پیغمبروں کو اور بہت ساری اللہ کی کتابوں کو ماننے والے تھے، ان کے بعد بھی کئی پیغمبروں کو ماننے والے آئے؛ لیکن ان پر بھی کچھ مسائل اور کچھ مصائب پیش آئے اور ذلت ونکبت ومصیبت وپریشانی سے انھیں دوچار ہونا پڑا، حالاں کہ وہ اللہ کی کتابوں کو بھی مانتے تھے اور اللہ کے پیغمبروں کو بھی مانتے تھے، اللہ نے جگہ جگہ بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا ہے؛ پہلا ہی پارہ آپ کھولیں گے، تو بنی اسرائیل کا تذکرہ بہت تفصیل سے ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ ایک وہ قومیں تھیں، جو اللہ کو نہیں مانتی تھیں؛ اللہ کے پیغمبروں کو نہیں مانتی تھیں، اللہ کی دعوت کو اور اللہ کے دین کو نہیں مانتی تھیں، ان کو اللہ نے غارت کیا، تباہ کیا، برباد کیا اور مختلف زمانوں کے اندر، جو اس طرح کی قومیں پیدا ہوتی تھیں، تو اپنے اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس کی تاریخ قرآن کے اندر موجود ہے، اسی کے ساتھ دوسری ان قوموں کا بھی ذکر ہے، جو اللہ کی کتابوں کو، رسولوں کو ایک حد تک ماننے والے تھے، ان پر بھی حالات پیش آئے، مسائل پیش آئے، مصائب پیش آئے، بڑے سخت احوال پیش آئے اور کبھی ان کو خنزیر بنا کر اور کبھی بندر بنا کر دنیا میں ذلیل وخوار کیا گیا، تو کبھی کسی اور آفت ومصیبت میں ان کو گرفتار کیا گیا اور کبھی وادیٔ تیہ کے اندر ان کو چالیس سال تک بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور اسی طرح ان کے لیے حلال چیزیں تھیں؛ لیکن ان کے کرتوت کے نتیجے میں اللہ نے ان کو حرام قرار دے دیا اور یہ بھی بتایا کہ چالیس

سال تک بھٹکنے کے لیے وادیوں میں ان کو چھوڑ دیا گیا ہے اوران بنی اسرائیل پر وہ بستی، جو ان کی اپنی بستی تھی؛ وہ بھی حرام کردی گئی ہے، وہاں وہ داخل ہی نہیں ہوسکتے۔

اب یہ قوم، جس کا ذکر ہو رہا ہے، نبیوں کو نہ ماننے والی قوم نہیں ہے، یہ قوم ماننے والی ہے، نبیوں کو ماننے والی، پیغمبروں کو ماننے والی، ان کی کتابوں کو ماننے والی؛ لیکن اس کے باوجود اُن کے ساتھ یہ حالات پیش آئے۔

یہ واقعات قرآن میں کیوں بیان کیے گئے؟

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے تاریخ کا، تاریخ کے احوال وکوائف اور زمانے کے حالات اور واقعات کا اوراسی طرح اصول وضوابط اس کے اندر بیان کردیے گئے ہیں، کہ کن بنیادوں پر کسی قوم کو پروان چڑھایا گیا اور کن کن بنیادوں پر کسی قوم کو تباہ وغارت کیا گیا؟

واضح طور پر اللہ نے اپنے کلام کے اندر یہ ساری باتیں جگہ جگہ بیان کر کے اپنا طور طریقہ اوراپنی سنت اوراپنا جو حکم اور فیصلہ ہوتا ہے، اس کی جو بنیادیں ہوتی ہیں، ان سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا ہے۔ یہ کیوں واضح کیا گیا؟ ہم کو غور وفکر کی دعوت دینے کے لیے کہ تم بھی غور وفکر کرو، اپنے حالات پر غور کرو، اپنی کیفیات پر غور کرو، اپنے اخلاق وکردار پر غور کرو، اپنے ایمان کے درجات پر غور کرو، اپنے یقین پر غور کرو، اپنی عبادات پر غور کرو، اعمال پر غور کرو۔

ان ساری چیزوں پر غور کرکے یہ دیکھ لو کہ تمھارے ساتھ، جو مسائل اوراحوال پیش آرہے ہیں، وہ احوال دراصل ان ہی اصولوں کے مطابق پیش آرہے ہیں، جو پچھلی قوموں کے اندر اللہ نے برتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے اصول نہیں بدلتے

قرآن میں اللہ نے یہ بھی بتلایا کہ ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً ﴾ (فاطر: ۴۳) (اللہ کی سنت اور اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی)

اللہ تعالیٰ کے اصول وضوابط میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، کبھی کچھ کردے، کبھی کچھ کردے، کبھی کچھ ہوجائے، کبھی کچھ ہوجائے، نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اصول ہے، ایک ضابطہ ہے، اس کی ایک سنت ہے، ''سنت'' یہاں ضابطے کو کہا گیا ہے، قانون کو فرمایا گیا ہے کہ وہ اٹل قانون ہے، وہ اٹل اصول ہے، اسی کے مطابق اس پوری کائنات میں اصول جاری کیا گیا ہے، قوم کوئی بھی ہو، افراد کوئی بھی ہوں اور کسی بھی زمانے کے ہوں اور کسی بھی علاقے کے رہنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ اس کو نہیں دیکھتے، دیکھتے یہ ہیں کہ ان اصول پر کون ٹھیک اترتا ہے اور کون ٹھیک نہیں اترتا؟ لیکن ہم ان پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جب یہ حالات پیش آتے ہیں، مصائب پیش آتے ہیں؛ تو ہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ایسا ہمیشہ نیک لوگوں کے ساتھ ہوا ہے؛ اس لیے ہمارے ساتھ بھی ہورہا ہے، یعنی اپنے آپ کو ہم پہلے ہی نیک ٹھہرا لیتے ہیں، نیک ٹھہرا کر اس پر یہ احوال فٹ کرتے ہیں کہ یہ احوال جو پیش آرہے ہیں، یہ نیک لوگوں پر پیش آنے والے احوال ہیں، انبیا پر پیش آئے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم پر پیش آئے تھے اور بزرگوں پر پیش آئے تھے، بڑے بڑے اولیاء اللہ پر پیش آئے تھے، اسی طرح ہم پر یہ حالات پیش آرہے ہیں، گویا کہ ہم بھی اولیاء اللہ ہیں، صحابہ کے درجے کے ہیں، اللہ پر یقین میں، ایمان میں، ہمارا تو کوئی ثانی نہیں ہے، ہمارے اخلاق میں کردار میں اعمال میں کوئی فتور اور کوئی قصور نہیں ہے۔

مگر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہمارا یہ انطباق صحیح بھی ہے یا نہیں؟ یہ تو اپنی جگہ صحیح

ہے کہ حالات انبیا پر بھی پیش آئے، حالات صحابہ پر بھی پیش آئے، حالات اولیاء اللہ پر بھی پیش آئے، دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ قومِ عاد پر بھی پیش آئے، قومِ ثمود پر بھی پیش آئے، بنی اسرائیل پر بھی پیش آئے، دونوں چیزیں ہونی چاہیں سامنے، اب دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر ان میں سے وہ اصول آپ کو نکالنا پڑے گا، جن اصولوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں بیان فرمائیں، قومِ عاد وثمود کے لیے ہلاکت کا فیصلہ کس اصول پر تھا؟ حضراتِ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور نیک لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصائب ومسائل پیش آئے، تو کس اصول کی بنا پر؟ اچھے لوگوں کو نعمت مل رہی ہے، تو وہ کس اصول کی بنیاد پر؟ برے لوگوں کو نعمت ملتی ہے، تو وہ کس ضابطے کے تحت؟ ظاہر بات ہے کہ دونوں جگہ الگ الگ اصول ہیں، اِن کے لیے الگ اصول ہیں، اُن کے لیے الگ اصول ہیں۔

نعمت بلا طاعت مصیبت ہے

اب میں آپ کو قرآن وسنت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے یہ اصول بتانا چاہتا ہوں۔ قرآن اور حدیث سے جو اصول سمجھ میں آتا ہے اور جو ہمارے بڑوں نے سمجھا، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نعمت کے ساتھ اطاعت وفرماں برداری بھی کرتا ہے، تو وہ نعمت، نعمت ہے اور اگر نعمت کے ساتھ اطاعت کی جگہ معصیت ہے؛ تو سمجھو کہ وہ نعمت اس کے حق میں نعمت نہیں؛ بل کہ دراصل اس کے حق میں مصیبت ہے۔ صورتاً نعمت ہے؛ مگر حقیقتاً وہ مصیبت ہی مصیبت ہے۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ، حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ

مُّبْلِسُوْنَ. ﴾ (الأنعام:۴۴)

(جن چیزوں کی انھیں یاددہانی کی گئی تھی، اس کو انھوں نے بھلا دیا، تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دہانے کھول دیے، جب نعمتیں لے کر وہ خوب خوش ہو گئے، اترانے لگے؛ تو ہم نے اچانک ان کو پکڑ لیا۔)

اس آیت میں بھول اور نسیان سے مراد صرفِ نظر کر لینا ہے، ترک اور غفلت مراد ہے؛ اس لیے کہ نسیان (بھولنا) جس کو کہتے ہیں، یہ تو غیر اختیاری ہوتا ہے، اس پر تو پکڑ بھی نہیں ہے؛ اسی لیے عربی میں ''نِسْیَان'' جس طرح بھول وذہول کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح عربی زبان میں ''نِسْیَان''، ترک وغفلت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو یہاں یہی مراد ہے ترک وغفلت۔

یہ کیا عجیب آیت ہے! اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: جن چیزوں کی انھیں یاددہانی کی گئی تھی، جو سبق ان کو پڑھایا گیا تھا، انھوں نے اس سے صرفِ نظر کیا، توحید کے سبق کو بھلا دیا، اللہ کی وحدانیت کے سبق کو، اللہ کی محبت اور اللہ کے عشق کے سبق کو اور آخرت کو، نیکی کے سبق کو، اچھائی کو، عبادت کے سبق کو؛ ان اسباق کو جب انھوں نے بھلا دیا، اللہ کی نافرمانی کرنے لگے اور اللہ سے بغض وعناد اور اللہ کے پیغمبروں کی تعلیمات سے روگردانی واعراض کرنے لگے، من مانی زندگی گزارنے لگے؛ تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دہانے کھول دیے۔ مال ودولت کی فراوانی ہو رہی ہے، کھانے اور پینے کا سامان بے تحاشہ دیا جا رہا ہے، مال ودولت پیروں میں ہے، کپڑوں میں ہے، ہر چہار طرف ان پر نعمتوں کی بارش کر دی گئی ہے۔

اب دنیا کی دولتیں ملنے پر کوئی بے وقوف یہ سمجھنے لگے کہ میں خدا کا بہت نیک بندہ ہو گیا ہوں، میں اللہ کا بہت محبوب بندہ ہو گیا ہوں، تو یہ بڑا بے وقوف ہے۔

محض ظاہری نعمتوں کا مل جانا، یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آدمی خدا کا محبوب ہے؛ بل کہ اسے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ اطاعت بھی میرے اندر موجود ہے؟ ایمان ویقین بھی میرے پاس پایا جاتا ہے یا نہیں پایا جاتا؟

کافروں اور نافرمانوں کو نعمتیں کیوں دی جاتی ہیں؟

کافروں اور فاسقوں کو نعمت دینا، دراصل ان کو پھنسانے کے لیے ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھو: جیسے پرندے کو پکڑنے کے لیے جال ڈالا جاتا ہے اور اس جال میں اس کو پھانسنے کے لیے کچھ دانے ڈال دیے جاتے ہیں، اب جال بچھا ہوا ہے، دانے نظر آرہے ہیں پرندوں کو، پرندہ اوپر سے یہ دیکھ رہا ہے کہ میرا کھانا یہاں موجود ہے؛ لہٰذا وہ کھانا کھانے آتا ہے اور جال میں پھنستا ہے، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ ان کافروں کو جہنم میں پھانسنے کے لیے دنیا کی دولتوں کے دہانے کھول دیتے ہیں اور کافر ان دولتوں کو لینے کے لیے اس میں کود پڑتے ہیں اور جہنم میں جا گرتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے:

﴿ اَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّھُمۡ بِہٖ مِنۡ مَّالٍ وَّبَنِیۡنَ ، نُسَارِعُ لَھُمۡ فِی الۡخَیۡرٰتِ ، بَلۡ لَّا یَشۡعُرُوۡن ﴾ (المؤمنون: ۵۵-۵۶)

(کیا یہ کافر خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو جو مال واولاد سے نواز رہے ہیں (یہ اس بات کی دلیل ہے) کہ ہم ان کو بھلائیاں پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں، حقیقت یہ کہ ان کافروں کو شعور ہی نہیں ہے۔)

اسی رکوع میں آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿حَتّٰی اِذَآ اَخَذۡنَا مُتۡرَفِیۡھِمۡ بِالۡعَذَابِ اِذَا ھُمۡ یَجۡئَرُوۡن﴾ (المؤمنون: ۵۷)

(یہاں تک کہ جب ہم ان عیش پسند کافروں کو عذاب میں پکڑتے

ہیں، تو چلانے لگتے ہیں۔)

ان آیتوں میں اللہ نے صاف کہا ہے کہ کافروں، فاسقوں اور مجرموں کا اپنے مال و اولاد کی فراوانی کو دیکھ کر یہ سمجھنا، کہ یہ اللہ کی طرف سے ان پر نعمتوں کا نزول ہے، ان کی جہالت اور حماقت اور بے شعوری کا نتیجہ ہے، دراصل یہ نعمت نہیں؛ بل کہ مصیبت کا پیش خیمہ ہے، جس کا انجام عذاب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

اللہ نے فرعون کو کیا کیا نہیں دیا تھا؟ کتنی بڑی دولت نہیں دی تھی؟ چار سو برس کی زندگی میں کبھی سر کا درد نہیں ہوا، چار سو برس کی طویل زندگی کے اندر کبھی اس کو کسی نعمت کی کمی محسوس نہیں ہوئی، اللہ نے بے شمار دولتیں اس طرح اس کو عطا فرما دیں کہ ذرہ برابر اس میں کمی نہیں؛ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ اِترانے لگا، اس قدر اِترایا، اس قدر اِترایا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس نے دعویٰ کیا: ﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾ (النازعات: ۲۴) (میں ہی خدا ہوں!)۔

اب جب یہ ہوا؛ تو نتیجہ کیا ہوا؟ وہ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کس طرح پھانسا اور جہنم رسید کر دیا گیا؟ ایسی بے شمار مثالیں ہیں، قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے؛ تو مل جائیں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت اس لیے دیتے ہیں، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے، نافرمانی کے ساتھ نعمتوں کا ملنا؛ دراصل اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ وہ جہنم رسید ہونے والا ہے، بڑی مصیبت آنے والی ہے، ذلت وخواری و رسوائی ہونے والی ہے؛ لیکن اگر یہ نہیں سمجھے گا؛ تو یہی حشر ہوگا، جو فرعون کا ہوا، شداد کا ہوا۔

شداد کا واقعہ

شداد دنیاوی لحاظ سے کتنا بڑا آدمی تھا؟ اس کے بارے میں ایک عجیب روایت

میں نے پڑھی کہ شداد پیدا ہوا، تو ایک سمندر میں اس کی ماں سفر میں تھی، کشتی میں بیٹھ کر جارہی تھی، راستے میں طوفان آیا، جس کی وجہ سے کشتی سمندر کے تھپیڑوں میں آکر برباد ہوگئی، صرف ایک تختہ رہ گیا، سارے لوگ بھی غرق ہوگئے، برباد ہوگئے؛ لیکن ایک تختے پر ایک عورت اور اس کی گود میں ایک بچہ بچ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسی وقت حضرت عزرائیل عَلَیْہِ السَّلَام کو حکم بھیجا کہ جاؤ، سمندر میں اور اس تختے پر جو عورت اور بچہ ہیں، ان میں سے اس ماں کی روح قبض کرلو۔ اللہ کی حکمت، اللہ کی قدرت و جلالت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

سمندر میں ایک تختے پر ماں اور ایک بچہ، اس کے سوا کوئی نہیں اور وہیں روح قبض کرنے کا حکم آرہا ہے کہ ماں کی روح قبض کرلو، ماں کی جب روح قبض ہوگی، تو وہ بھی گر جائے گی اور بچہ ایک تختے پر رہ جائے گا اور وہاں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

خیر انھوں نے روح قبض کرلی اور ماں غرق ہوگئی اور بچہ رہ گیا تختہ پر اور وہ تختہ تیرتے تیرتے ایک کنارے پر لگا، وہاں مچھیرے موجود تھے، انھوں نے دیکھا کہ ایک بچہ آرہا ہے، دیکھا تو بڑا حسین و جمیل تھا، ان میں سے کسی نے اسے اٹھایا اور کہا کہ میرے پاس تو بچے ہیں نہیں، میں ہی اس کو پال لیتا ہوں، تو ایک غریب مچھیرے نے اس کو اٹھایا اور اس کو پالا، جب یہ بڑا ہوا، تو ایک جگہ کھیل رہا تھا، راستے میں کھیلتا ہوا دیکھتا ہے کہ ایک بادشاہ کا لشکر وہاں سے جارہا ہے، اس لشکر میں ایک آدمی تھا، جسے کہیں سے ایک سرمہ ملا تھا؛ لیکن یہ سرمہ اپنے اوپر آزمانے سے پہلے یہ چاہتا تھا کہ کسی اور پر آزماؤں؛ اس لیے کہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سرمہ کیسا ہے؟ تو اس لشکری نے آکر سرمے کی ایک سلائی لی اور اس بچے سے کہا کہ دیکھ یہ سرمہ ہے، بہت اچھا ہے، تجھے لگاتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے لگادیا۔

جب اس بچے کو سرمہ لگایا، تو اسے زمین کے خزانے نظر آنے لگے؛ لیکن تھا وہ بہت چالاک؛ اس لیے کہ یہی شداد بننے والا تھا، تو اس بچے نے چیخنا شروع کر دیا، خوب زور زور سے چیخا، جب زور زور سے چیخا، تو یہ آدمی پریشان ہو گیا کہ اسے کچھ ہو گیا ہے، کچھ مصیبت آ گئی ہے، سرمہ اسے فٹ نہیں ہوا، آنکھ اس کی ضائع ہو گئی ہے؛ اس لیے سرمے کی تھیلی وہیں چھوڑ کے بھاگ گیا، وہ بھاگا تو اس نے سرمے کی تھیلی اٹھالی اور اپنے باپ کو جا کر کہا کہ میرے ساتھ ایسا ایسا واقعہ پیش آیا، میں نے چالاکی کی، تو وہ سرمہ چھوڑ کے بھاگ گیا اور اس سرمے میں ایسی تاثیر ہے کہ مجھے پورے خزانے زمین کے نظر آ رہے ہیں کہ وہاں سونا ہے، وہاں چاندی ہے، وہاں ہیرے ہیں، وہاں جواہرات ہیں؛ سب مجھے نظر آ رہا ہے، اس نے کہا کہ چلو، جب یہ بات ہے، تو کھدائی کریں گے، تو اب باپ بیٹے نے مل کر کھدائی شروع کر دی، جہاں جہاں یہ بچہ دکھاتا تھا کہ یہاں مجھے یہ نظر آ رہا ہے، وہاں کھدائی کی اور سونا مل گیا، کہیں چاندی مل گئی، کہیں کچھ ہیرے مل گئے، کہیں کچھ مل گیا، اب یہ کھودتے کھدواتے کروڑ پتی، ارب پتی، بڑے مال دار ہو گئے، ادھر یہ بچہ بھی بڑا ہوا، اس کے بعد اس بچے نے جو بڑا ہو چکا تھا، وہاں کے بادشاہ پر بھی حملہ کر دیا اور بادشاہ پر قابض ہو کر اس کی بادشاہت چھین لی، حتیٰ کہ خود بادشاہ بن گیا۔

دیکھو! وہ بچہ ایک کشتی میں تھا، وہ بھی ایک تختے پر تھا، اللہ نے اسے بقا عطا کیا اور پھر یہاں تک پہنچایا۔

شداد کا انجام

ایک عرصے کے بعد اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے دنیا میں جنت بنانا ہے، نبیوں کا مخالف، اللہ کا مخالف، بڑا سرکش ہو گیا، دماغ میں یہ سمایا کہ اب

دنیا میں جنت بنانا ہے، چناں چہ اس نے جنت بنائی، بہت بڑے علاقے پر اس کے گھر بسائے، عالی شان عمارتیں بنائیں، اس کے اندر درمیان میں باغیچے بنائے، جو کچھ اس کے بس میں تھا، اس نے وہ سب کچھ کیا اور جب سب کچھ تیار ہو گیا، تو اس کو بتایا گیا کہ آج تمھاری جنت کا اِنا گَریشن (افتتاح) ہے، چلیے۔

اب وہ جو افتتاح کرنے کے لیے گیا، تو اپنی اس جنت کے اندر جانے کے لیے جوں ہی ایک قدم اندر رکھتا ہے؛ وہیں عزرائیل عَلَیْہِ السَّلَام کو حکم ہوتا ہے کہ اس آدمی کی روح قبض کرلو، حضرت عزرائیل عَلَیْہِ السَّلَام آئے اور اس کی روح قبض کرلی، وہ اندر جا ہی نہ سکا۔

حضرت عزرائیل عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک موقع پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں نے روحیں تو بہت نکالی ہیں؛ لیکن ایک ہی آدمی پر دو دفعہ بڑا رحم آیا، اللہ نے پوچھا کب؟ کہا کہ ایک بار اس وقت جب وہ (شداد) پیدا ہوا، تو سمندر میں اس کی ماں کی روح قبض کرنے کا حکم آیا، تو مجھے اس بچے پر رحم آیا تھا اور دوسری مرتبہ اسی بچے نے جب جنت بنائی اور جب جنت میں قدم رکھا، تو آپ کا حکم آیا کہ اس کی روح قبض کرلو، تب بھی بڑا رحم آیا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ایسی بے شمار مثالیں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نعمت کا مل جانا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ انسان اللہ کا محبوب ہے؛ بل کہ ہوسکتا ہو کہ یہ نعمت اس کے حق میں ہلاکت بننے والی ہو، دیکھو! اللہ نے کتنی بڑی دولت اس کو عطا فرمائی اور حیرت انگیز طریقے پر اس کو یہ دولتیں عطا فرمائیں؛ لیکن جب اس کو پکڑا، تو کیسے پکڑا؟!!

قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ خَيۡرٌ لِّاَنۡفُسِهِمۡ ، اِنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴾ (آل عمران: ۱۷۸)

(اور کافر یہ خیال نہ کریں کہ ہم ان کو جو ڈھیل دے رہے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو ان کو اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں؛ تا کہ وہ گناہوں میں اور آگے بڑھیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔)

اس آیت میں کافروں کو سخت دھمکی دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنے حق میں بھلائی خیال نہ کریں؛ بل کہ یہ ایک اللہ کی طرف سے ڈھیل ہے، جو اس لیے دی جارہی ہے کہ جب وہ گناہوں میں مزید آگے بڑھیں گے، تو اتنی ہی سخت سزا ان کو دی جائے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمتیں کافروں کے حق میں مصیبت ہیں، نعمت نہیں۔

مؤمنوں اور نیک لوگوں کو دولت دینے کا اصول

حضرات! یہ ایک اصول اللہ تعالیٰ کا آپ کے سامنے رکھا گیا، اب لیجیے دوسری طرف نیک لوگوں کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نعمتیں دیتے ہیں، نیک لوگوں کو مصیبتیں بھی دیتے ہیں؛ لیکن یہاں کا اصول الگ ہے، یہاں نعمت دینے کا یا مصیبت دینے کا اصول وہ نہیں، جو کفار کے لیے ہے، جو ابھی آپ کو سمجھایا کہ وہاں نعمت اس لیے دی جارہی ہے کہ انھوں نے خدا کو بھلایا ہے، خدا کی معصیت کی ہے، اللہ کے احکام کو ٹھکرایا ہے؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ دولت اس لیے دے رہا ہے؛ تا کہ دولت کے ذریعے ان کو پھانسا جائے اور ایک دم سے ان کی پکڑ کی جائے؛ یہاں تک کہ جہنم رسید کر دیا جائے؛ لیکن نیک لوگوں کو نعمت دی جاتی ہے، تو اس لیے نہیں کہ ان کو پھانسنا چاہتے ہیں؛ بل کہ انھیں نعمت اس لیے دی جاتی ہے؛ تا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو لے کر اللہ کی اس

کائنات میں اللہ کے دین کو نافذ کرسکیں، دنیا میں رہتے ہوئے عبادت کرسکیں، دنیا میں رہتے ہوئے اللہ کے بندوں کی خدمت کرسکیں، اللہ کا شکر کریں، اللہ کی نعمتوں کو استعمال کر کے عبادات پر تقویت حاصل کریں وغیرہ۔

قرآن میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ، وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ (الحج :۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دے دیں؛ تو یہ نماز قائم کریں گے، زکاۃ ادا کریں گے، امر بالمعروف کریں گے اور نہی عن المنکر کریں گے اور انجام تمام کاموں کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔)

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نیک لوگ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوت پا کر، حکومت پا کر، نعمت پا کر تین بڑے بڑے اور اہم کام کریں گے:

(۱) ایک یہ کہ اقامتِ صلاۃ کریں گے اور اس میں تمام عبادت مراد ہیں۔

(۲) دوسرے: ایتائے زکاۃ، اس سے خدمتِ خلق مراد ہے۔

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اس سے دعوت وتبلیغ مراد ہے۔

”نماز قائم کرنا“ ایک اصطلاح ہے

مذکورہ آیت میں آیا ہے کہ جن مؤمنین کو ہم حکومت دیں گے ”وہ لوگ نماز قائم کریں گے“، یہاں یہ سمجھ لیجیے کہ ”اقامتِ صلاۃ“ (نماز قائم کرنا) یہ ایک اصطلاح ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ عبادات کے سلسلے میں اللہ کا بھیجا ہوا مکمل سسٹم نافذ کریں؛ لیکن نماز اس کا عنوان ہے؛ اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اہم ترین چیز کو

بیان کر دیا جاتا ہے اور ضمناً ساری چیزیں مراد لے لی جاتی ہیں؛ لٰہذا یہ نماز قائم کرنا ایک عنوان ہے؛ اس لیے کہ وہ سب سے اہم عبادت ہے، اس کو بیان کرنے کا مطلب ہے کہ جتنی چیزیں اس کے ضمن میں آتی ہیں؛ سب کچھ مراد ہیں، یعنی وہ لوگ مساجد قائم کر دیں گے اور نماز قائم کرنے کے لیے ضرورت یہ بھی ہوگی کہ وہ نماز کو سیکھیں اور سکھائیں؛ اس لیے مدارس بھی قائم کر دیں گے، علما بھی اس کے لیے تیار کریں گے، حفاظ بھی اس کے لیے تیار کریں گے؛ اس لیے کہ یہ سب نہیں ہوں گے، تو بھی نماز نہیں ہوگی ، مدرسہ نہیں ہوگا؛ تو قرآن کون پڑھائے گا؟ مدرسہ نہیں ہوگا، تو حدیث کون پڑھائے گا؟ مدرسہ نہیں ہوگا؛ تو امام کہاں سے ملے گا؟ اور مدرسہ نہیں ہوگا؛ تو خطیب صاحب کہاں سے آئیں گے؟ اسی لیے علما کا تیار کرنا ضروری ہوگیا، حفاظ کا پیدا کرنا ضروری ہوگیا؛ تا کہ یہ نماز اور مسجد کا نظام چل سکے۔

''زکاۃ'' بھی خدمت خلق کا ایک عنوان ہے

اس آیت میں دوسرے بات یہ ہے کہ وہ لوگ ''زکاۃ دیا کریں گے''، یہاں ''زکاۃ دینا'' بھی عنوان ہے، خدمتِ خلق کا یعنی یہ خدمتِ خلق کریں گے۔ زکاۃ کا نظام بنا کر محتاجوں، بیواؤں، یتیموں، معذوروں کی معاشی و تعلیمی وطبی ضروریات پوری کریں گے۔ یہ رفاہی خدمات کا اہم ترین نظام ہے، جس کا ہونا لازم وضروری ہے۔

قرآنِ کریم اور سیرتِ نبویہ کا مطالعہ کیجیے، تو یہ دکھائی دے گا کہ اسلام ان رفاہی وسماجی کاموں کو کس قدر اہمیت دیتا ہے؟ یہاں صرف چند اشارات اس سلسلے کے پیش کیے جاتے ہیں:

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے متقی و نیک لوگوں کی صفات کا جو نقشہ بیان کیا ہے، اس میں ایمان وعبادات کے ساتھ ان فلاحی وملی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے، چناں چہ

فرمایا:

﴿ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَ السَّآئِلِيۡنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

(بھلائی کا کام یہی نہیں کہ مشرق یا مغرب کی جانب رخ کرلیا کرو، بل کہ بھلائی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں اور غلاموں کو چھڑانے میں مال خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکاۃ دے اور یہ لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ جب وہ کسی کام کا وعدہ کرلیں اور تنگ دستی، بیماری میں اور جنگ کے موقع پر مستقل مزاج ہوں، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں، جو تقوی شعار ہیں۔)

غور کیا جائے کہ اس طویل آیتِ کریمہ میں بھلائی و نیکی کا ایک جامع و وسیع تصور پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمان و عبادات کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں کے لیے اور غلاموں کو چھڑانے کے سلسلے میں مال خرچ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے، نیز اخلاقی امور میں سے

ایفائے عہد اور مصائب وآفات کی پیش آنے پر صبر کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آیت کے اخیر میں ان تمام امور کو ''صدق وتقوے'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام صرف ایمان وعبادات ہی تک محدود نہیں؛ بل کہ وہ اس سے وسیع اپنا دائرۂ کار رکھتا ہے، جس میں اخلاقی ومعاشرتی تعلیمات بھی داخل ہیں۔

احادیثِ شریفہ میں بھی اس کے متعلق ہدایات وتعلیمات موجود ہیں اور کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ ضروری ہے، عرض کیا گیا کہ اگر وہ کچھ نہ پائے، تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے کمائے اور خود کو بھی نفع پہنچائے اور دوسروں کو صدقہ دے۔ کہا گیا کہ اگر اُسے اِس کی بھی طاقت نہ ہو، تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ فریادی یا مظلوم اور حاجت مند کی امداد کرے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے تو؟ آپ نے فرمایا کہ نیکی وبھلائی کی بات لوگوں کو بتائے۔ عرض کیا گیا کہ اگر یہ بھی نہ کر پائے تو؟ آپ نے فرمایا کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے باز رہے۔ یہی اس کے حق میں صدقہ ہوگا۔

(البخاري:٦٠٠٢،سنن البيهقي:٨٠٧٣، الأدب المفرد:٢٢٥،شعب الإيمان:٣٠٥٤)

حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ بیوہ اور مسکینوں کی حاجت براری کے لیے کوشش کرنے والا ایسا ہے، جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا یا رات بھر عبادت اور دن بھر روزہ رکھنے والا۔

(البخاري:٦٠٠٦،مسلم:٧٦٥٩)

ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں اس طرح پاس پاس ہوں گے، جیسے یہ دو انگلیاں یعنی انگوٹھا اور شہادت کی انگلی۔ (البخاري:٦٠٠٥،مسلم:٧٦٦٠)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ ، فَأُحَبُّهُمْ إِلَى اللّٰهِ أَنْفَعُهُمْ لِعَيَالِهِ.»

(مسند البزار:٦٩٤٧،مسند أبي يعلى:٣٣١٥،شعب الإيمان:٧٠٤٦)

(ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ شخص وہ ہے، جو اللہ کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔)

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے دین کا ایک بڑا حصہ وہ ہے، جس کا تعلق خدمتِ خلق سے ہے اور یہ کام بڑا بھاری بھرکم اور بڑا اجر وثواب کا باعث ہے۔

اسی شعبے کو ایتائے زکاۃ کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، کہ جن کو ہم حکومت وطاقت دیں گے، وہ مؤمن لوگ عبادتِ حق کے ساتھ خدمتِ خلق کا کام بھی کریں گے۔

''امر بالمعروف'' و ''نہی عن المنکر'' کی حقیقت

ایک تیسری بات، جو اس آیت میں آئی ہے: وہ یہ ہے کہ وہ حضرات ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کریں گے، یہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' بھی ''دعوت الی اللہ'' کا ایک عنوان ہے اور اس میں تمام دعوت کے شعبے آجاتے ہیں۔

لہٰذا اللہ جن کو حکومت وطاقت دے؛ تو ان کا ایک اہم کام یہ بھی ہے؛ کیوں کہ یہ اللہ کے بندے یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ نیکی وطاعات، خوبی ومعروفات کا سلسلہ جاری رہے اور برائیاں اور خبائث دنیا میں نہ رہیں، بہترین وخوش گوار فضا

میں لوگ زندگی گزاریں؛ ورنہ برائیاں ہوں گی معاشرے میں؛ تو سارا معاشرہ پریشان رہے گا، چوری کا خوف، ڈاکے کے خطرہ، حسد و بغض اور کینے وغیرہ کی وجہ سے مسائل، لڑائی و جھگڑا، قتل و غارت گری؛ یہ سب امراض و برائیاں ختم ہوجانا چاہئیں، اس کے لیے محنت ہوتی ہے کہ لوگوں میں معروفات کی اشاعت ہو اور منکرات کی اصلاح ہو اور لوگوں کو اللہ کے دین کی جانب دعوت دی جائے۔

الغرض بتانا یہ ہے کہ اللہ ان کو بھی نعمت دیتا ہے؛ لیکن ان نیک لوگوں کو نعمت اس لیے دیتا ہے کہ دنیا کے اندر اللہ کا نظام قائم کریں، دین نافذ کریں اور مخلوق کی خدمت کریں اور عبادت کو قائم کریں اور یہ ان کا کام ہوگا؛ اس لیے اللہ ان کو دولتیں دیتا ہے۔

نیک لوگوں پر مصائب کیوں آتے ہیں؟

جس طرح نیک لوگوں کو نعمتیں دی جاتی ہیں، اسی طرح ان کو مصائب میں بھی مبتلا کیا جاتا ہے؛ لیکن ان پر جو مصیبتیں آتی ہیں، وہ اس لیے نہیں آتیں کہ یہ گنہ گار ہیں، وہ گناہ نہیں کررہے ہیں، وہ تو اللہ کی عبادت کررہے ہیں، وہ مخلوق کی خدمت کررہے ہیں، وہ دین کی دعوت کا کام کررہے ہیں، اللہ کے دین کی اشاعت کا اور اللہ کے دین کی حفاظت کا کام کررہے ہیں؛ لیکن اس کام کے درمیان میں بھی ان پر مصائب آئیں گے، مسائل آئیں گے، بڑے حالات پیش آئیں گے؛ جیسے انبیا کو پیش آئے تھے، صحابہ کو پیش آئے تھے، گالی دینے والے پیدا ہوجائیں گے اور ان کے خلاف مختلف انداز سے لوگ سازشیں کرتے پھریں گے، یہ سب کچھ ہوگا؛ لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوگا؟ اس لیے ہوگا کہ ان کے درجات کو بلند کرنا مقصود ہے، ان مصائب کی وجہ سے وہ اللہ کے اور مقرب بن جاتے ہیں، تو ان کے لیے الگ اصول

ہو گیا۔

الگ الگ اصول ہیں، جن کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے، آج جب ہمیں مسائل اور مصائب پیش آتے ہیں، تو ہم یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو اس لیے یہ مسائل اور مصائب پیش آرہے ہیں کہ ہم صحابہ کی طرح ہیں، اولیاء اللہ کی طرح ہیں، نیک لوگوں کی طرح ہیں؛ اس لیے ہمارے اوپر حالات پیش آرہے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ یہ اصول جو آپ نے قرآن سے نکالا، یہ آپ پر منطبق بھی ہو رہا ہے کہ نہیں ہو رہا؟۔

مولانا عمر صاحب پالن پوری رَحِمَهُ اللّٰهُ کی ایک مثال

مجھے حضرت مولانا عمر صاحب پالن پوری رَحِمَهُ اللّٰهُ کا ایک بیان یاد آیا، جو انھوں کئی سال پہلے "مرکز: نظام الدین" میں فرمایا تھا، اس میں حضرت نے ایک عجیب وغریب مثال بھی دی تھی۔

آپ نے فرمایا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طوطے کو پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ چوہے کو بھی پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے، پنجرے میں پہلے کچھ کھانا لگا دیا جاتا ہے؛ تاکہ چوہا اس میں گھسے اور گھستے ہی بند ہو جائے، چوہے کو دکھایا کہ تیری غذا یہاں موجود ہے، غذا ہی نہیں؛ بل کہ مرغوب غذا ہے، مرغوب ڈش تیری یہاں موجود ہے اور چوہا گھسا اور گھستے ہی دھڑام سے وہ پنجرا بند ہو گیا، اب وہ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، تو نہیں نکلتا، پنجرے میں بند ہو گیا۔

حضرت نے فرمایا کہ دیکھو چوہے کو پنجرے میں بند کیا جاتا ہے، تو پالنے کے لیے نہیں، مارنے کے لیے؛ لیکن طوطے کو پنجرے میں بند کیا جاتا ہے، تو مارنے کے لیے نہیں پالنے کے لیے، آپ طوطے کو پالنے بند کرتے ہیں یا مارنے؟ ارے کتنی

محبت سے پالتے ہیں؟ اس کی ٹائیں ٹائیں سننے کو طبیعت آپ کی چاہتی ہے، اس کو سننے کا شوق کرتے ہیں لوگ اور اسے چھیڑ چھیڑ کر اس کی ٹائیں ٹائیں سنتے ہیں اور اس کو کھانا بڑے اہتمام سے ڈالتے ہیں، بچے بھی، بوڑھے بھی، عورتیں بھی سب مل کر اُسے کھلاتے ہیں، دونوں کو پنجرے میں بند کیا؛ لیکن کتنا بڑا فرق ہے؟ ایک کو مارنے کے لیے بند کیا اور دوسرے کو خوش کرنے کے لیے بند کیا۔

طوطے کا پنجرا اس کی حفاظت کے لیے اور چوہے کا پنجرہ اس کو مارنے کے لیے اور ختم کرنے کے لیے ہے۔

یہ ایک بہترین مثال ہے سمجھنے کے لیے، اسی طرح نعمت کفار کو پکڑنے کے لیے اور مؤمن کو محفوظ رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔

امام جلال الدین رومی رحمہ اللہ کی ایک بات

یہیں سے میرا ذہن حضرت امام جلال الدین رومی رحمہ اللہ کی ایک بات کی طرف منتقل ہو گیا، انھوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے، ایک حدیث کی شرح میں، بہت ہی مشہور حدیث ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ.»

(دنیا مؤمن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔)

دنیا کافر کے لیے تو جنت ہے؛ لیکن مؤمن کے حق میں قید خانہ ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ ''مثنوی شریف'' میں فرماتے ہیں کہ جیسے طوطے کو پنجرے میں بند کر لیتے ہیں؛ لیکن کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کسی کوے کو بند کیا؟ مولانا روم رحمہ اللہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا کبھی یہ بھی دیکھا کہ کسی نے کوے کو بند کیا ہو اور اس کی کائیں کائیں کی بھدی سی آواز، انتہائی مکروہ قسم کی

آواز سننے کی کوشش کی ہو؟ نہیں! ایسا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ مؤمن کو قید خانے میں رکھتے ہیں، جیسے طوطے کو قید خانے یعنی پنجرے میں رکھتے ہیں؛ تاکہ اس کی ٹیں ٹیں سنیں، اللہ اسی طرح مؤمن بندے کو بھی قید خانے میں رکھ کر، جب وہ اللہ کو پکارے: ''اللہ، اللہ''؛ تو اللہ اس کی آواز سننا چاہتے ہیں؛ اسی لیے جب وہ ''اللہ، اللہ'' سے کہتا ہے کہ اللہ فلاں چیز عطا فرمائیں؛ تو اللہ دیر سے عطا کرتے ہیں، فوراً نہیں دیتے؛ اس لیے کہ اگر فوراً دے دیا جائے، تو آدمی اس کو لینے کے بعد بے خبر ہو جاتا ہے، اللہ کو پکارنا چھوڑ دیتا ہے، اللہ کو مؤمن کی آواز بہت پسند ہے؛ اس لیے دیر سے دیتے ہیں؛ تاکہ وہ روئے، گڑگڑائے، پلائے اور مؤمن کی ٹیں ٹیں اللہ سنتے رہیں؛ لیکن کافر اگر پکارتا ہے، تو اللہ اسے فوراً دے دیتا ہے، جیسے کوے کو فوراً اُڑا دیتے ہیں کہ یہ بھدی آواز نہ سنی جائے، اس کو اڑا دو۔

اس لیے مصائب آگئے، پریشانیاں آگئیں، آفات آگئے، کسی کا انتقال ہو گیا، کسی کے بچے کا مسئلہ آ گیا، کسی کی بیوی کا مسئلہ آ گیا اور بخار کا مسئلہ آ گیا، پریشانی ہوگئی، کھانا نہیں ملا، کچھ اور ہو گیا؛ یہ ساری باتیں اس لیے کہ مؤمن بندہ خدا کو پکارتا رہے، پکارتا رہے، پکارتا رہے۔

اپنا جائزہ

ان تمام تفصیلات کے بعد اب غور یہ کرنا ہے کہ کیا ہم پر جو مصیبتیں آرہی ہیں، حالات روز بہ روز ابتر ہوتے جارہے ہیں، مسلمانوں کے لیے زندگی تنگ ہوتی جا رہی ہے، زمین اپنی وسعت کے باوجود ان کے لیے تنگ نظر آرہیہے، یہ حالات، یہ مصائب، یہ پریشانیاں، یہ حوادث روز بہ روز پیش آتے جارہے ہیں، اس کی وجہ

کیا ہے؟

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بہت نیک ہوگئے ہیں؟ جیسے کہ حضراتِ انبیا علیہم الصلاۃ والسلام تھے اور ان پر مصیبتیں آئیں، یا جیسے حضراتِ صحابہ کرام ﷺ تھے، یا جیسے حضراتِ تابعین وتبعِ تابعین کے حالات تھے اور جیسے ہمارے اسلاف اور بزرگانِ دین کے حالات تھے، تو کیا ہم بھی اسی روش پر قائم ہیں اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر اور ترقی دینے کے لیے ایسی صورت پیدا کردی ہے؟ یا یہ کہ ہمارے اندر کچھ خامی اور کھوٹ اور عملی کم زوری، بدعملی اور بہت سارے عیوب، اخلاقی گراوٹ، معاشرتی تباہی؛ یہ ساری چیزیں ہمارے اندر درآئی ہیں اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ صورتِ حال پیدا کردی ہے؟

یہی ہے انطباق والا مسئلہ، اصول تو آپ کے سامنے عرض کردیا ہے؛ لیکن اس اصول کو سامنے رکھ کر اس کو ہمارے اپنے حالات پر منطبق کرنا کہ یہ کون سی صورت حال ہے کہ جس سے ہم دوچار ہیں؟ یہ بڑا مشکل ہے، کیا یہ انبیا والی صورتِ حال ہے؟ اولیا والی صورت ہے؟ صحابہ والی صورت ہے؟ یا یہ کہ کافروں والی صورت ہے؟ بدبختوں والی صورتِ حال ہے، جس کی وجہ سے کہ آج مسلمانوں کو رسوائی اور پسپائی اور ہر جگہ سے ذلت ونکبت اور مصیبت و پریشانی پیش آرہی ہے، کیا وجہ ہے کہ یہ صورتِ حال پیش آرہی ہے؟

قرآنِ کریم میں بنی اسرائیل کے لیے قانون

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پہلے میں چند آیاتِ کریمہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور وہ آیات ہیں بنی اسرائیل کے متعلق اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا اصول اور اپنا قانون اور اپنی سنت اور اپنا طریقہ قیامت تک کے لیے بیان کردیا

ہے، وہ اصول صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں ہے؛ بل کہ بنی اسرائیل ہو یا کوئی اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے اور قیامت تک پیدا ہونے والی تمام قوموں کے لیے ایک اصول ہے، ضابطہ ہے، قانون ہے، اس کو سننے کے بعد ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ اس اصول کو اپنے اوپر منطبق کرسکیں، وہ آیات یہ ہیں، ''سورۂ بنی اسرائیل'' میں بالکل ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے متعلق یہ بتایا ہے:

﴿ وَ قَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَ کَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ جَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءُا وُجُوْهَکُمْ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ کَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ﴾ (الإسراء:۴-۸)

(اور ہم نے کتاب میں فیصلہ کر کے بنی اسرائیل کو اس بات سے آگاہ کردیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کا مظاہرہ کرو گے، چناں چہ جب ان دو واقعات میں سے پہلا واقعہ پیش آیا، تو ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے، جو سخت جنگ جو تھے اور وہ تمھارے شہروں میں گھس کر پھیل گئے اور یہ ایک ایسا وعدہ تھا، جسے پورا ہو کر رہنا ہی تھا، پھر ہم نے تمھیں یہ موقع دیا کہ تم پلٹ کر ان پر

غالب آؤ اور تمھارے مال و دولت اور اولاد میں اضافہ کیا اور تمھاری نفری پہلے سے زیادہ بڑھا دی، اگر تم اچھے کام کروگے؛ تو اپنے ہی فائدے کے لیے کروگے اور برے کام کروگے؛ تو بھی وہ تمھارے لیے ہی برا ہوگا۔ چناں چہ جب دوسرے موقع کی میعاد آئی، تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا؛ تاکہ وہ تمھارے چہروں کو بگاڑ ڈالیں اور تاکہ وہ مسجد میں اسی طرح داخل ہوں، جیسے پہلے لوگ داخل ہوئے تھے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے، اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔ عین ممکن ہے کہ اب تمھارا رب تم پر رحم کرے؛ لیکن اگر تم پھر وہی کام کروگے، تو ہم بھی دوبارہ وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا ہی رکھا ہے۔)

ان آیاتمیں بنی اسرائیل کے حالات کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک اصول وضابطہ بھی بیان کر دیا ہے۔

آیاتِ کریمہ کی توضیح

ان آیات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اسی مسئلے کو سمجھایا ہے، کہہم نے بنی اسرائیل کے سلسلے میں کتاب میں یعنی تقدیر کی کتاب میں یہ لکھ دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بڑائی میں مبتلا ہو کر، تکبر میں مبتلا ہو کر، سرکشی کرنے لگو گے، جب پہلی دفعہ کا واقعہ پیش آیا، جب پہلا فساد ان لوگوں نے کیا، تو ان کا کیا حشر ہوا؟ کہتے ہیں کہ ہم نے تم پر اپنے ان بندوں کو مسلط کر دیا، جو بہت زبردست قوت وطاقت والے تھے، زبردست پکڑ والے تھے، ایسے بندوں کو ہم نے تم پر مسلط کر دیا، پھر وہ پھیل پڑے تمھارے شہروں میں۔

یہ کون لوگ تھے، جو ان پر مسلط کیے گئے؟ یہ کافر بادشاہ تھے، تاریخ بتاتی ہے کہ کافر بادشاہوں کو اللہ نے ان پر مسلط کیا، اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ پھر جب انھوں نے توبہ کر لی اور ظلم سے باز آ گئے، فساد سے اپنے آپ کو انھوں نے دور کر لیا، تو پھر ہم نے بھی معاملہ کو پھیر دیا اور تمھارے مال، تمھاری جائدادیں، جو لٹ گئی تھیں، پٹ گئی تھیں، قتل و غارت گری کا شکار ہو کر تباہ ہو گئی تھیں، پھر دوبارہ ہم نے تم کو دے دیا اور تمھاری جماعت کو بھی ہم نے بڑھا دیا، لشکر کو بڑھا دیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ﴾ کہ اگر تم اچھا کرو گے، تو یہ بھی تمھارے لیے ہے اور اگر برا کرو گے، تو یہ بھی تمھارے ہی حق میں تم برائی کر رہے ہو۔

پھر فرمایا کہ جب دوسری دفعہ تم نے ظلم کیا، فساد کیا، تباہیاں مچائیں، قتل و غارت گری پر اتر آئے، تو کیا ہوا؟ پھر تمھارے اوپر ہم نے ایسے ہی دشمنوں کو مسلط کیا؛ تا کہ وہ مار مار کر تمھارے چہروں کو بگاڑ دیں اور چہروں کو مسخ کر کے رکھ دیں اور جس طریقے پر پہلی دفعہ ہوا کہ وہ تمھاری مسجدوں میں گھسے تھے اور مسجدوں کو تاخت و تاراج کیا تھا اور مسجدوں تک میں تمھارا قتل و خون کیا، اسی طرح دوبارہ یہی ہوا کہ دوبارہ مسجدوں میں گھسے اور ظلم و فساد کیا اور جہاں تک ان کا بس چلا، اس قدر ان لوگوں نے تباہی مچائی۔

یہ دوسری دفعہ کے وعدے کے وقت میں ہوا۔ دو دو دفعہ فساد کیا اور دو ہی دفعہ اللہ کی طرف سے کافر بادشاہوں کو، ظالموں کو ان پر مسلط کر کے ان کی صرف جائدادوں، مالوں اور ان کی اولاد ہی کو نہیں؛ بل کہ ان کی مسجدوں تک کو ویران کر دیا گیا، مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، یہ کون سی مسجد ہے؟ جس کا یہاں اللہ نے ذکر کیا ہے؟ یہ

''مسجد بیت المقدس'' ہے، ''مسجد بیت المقدس'' میں کفار گھس گئے اور ظالم بادشاہ گھسا اور وہاں ظلم وفساد کی انتہا کردی، بیت المقدس کے اندر یہودیوں کا اتنا خون بہایا گیا، اتنا خون بہایا گیا کہ مسجد میں سوائے خون کے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا اور ان کی مذہبی کتابوں کو جلایا گیا، کتابوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی اور اسی طرح جو کچھ ان کے بس میں تھا، وہ سب انھوں نے کیا، یہ سب کچھ ہوا اور یہ سب کرنے والے کافر بادشاہ اور کافر لوگ تھے۔

آیات سے عبرت

اب غور کیجیے! یہ کس سے کہا جارہا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہا جارہا ہے، بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کو ماننے والے تھے، اللہ کے رسولوں پر یقین رکھنے والے تھے، اللہ کی کتابوں کو بھی تسلیم کرنے والے تھے، اللہ کے بہت سارے احکامات کو تسلیم کرنے والے بھی تھے؛ لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے فساد مچایا، ظلم کیا، سرکشی پر اتر آئے، بغاوت کرنے لگے، تو نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف ایسے لوگوں کو ان پر مسلط کیا، جو سخت پکڑ والے تھے، یعنی بڑی طاقت وقوت والے تھے۔

یہاں پر ایک بات عرض کرنا ضروری ہے: وہ یہ ہے کہ عام طور پر ایک بات ہمارے دماغوں میں آتی ہے کہ ہم تو مسلمان ہیں، اللہ کو ماننے والے ہیں اور اگرچہ ہم گنہ گار ہیں، کچھ عیوب اور کچھ کھوٹ ہمارے اندر ہیں؛ لیکن ہمارے علاوہ جو اور لوگ ہیں، جو ہمارے اوپر حاوی، ہمارے اوپر مسلط، ہمارے اوپر قابض اور ہم پر ظلم وزیادتی کرنے والے ہیں، وہ تو اللہ کو نہیں مانتے، رسول کو نہیں مانتے، اللہ کے باغی، اللہ کے سرکش، اللہ کی کتابوں کے مخالف، رسولوں کے مخالف اور اللہ کی تمام باتوں کا انکار کرنے والے اور جھٹلانے والے اور اس کے علاوہ ان کی زندگی بہت ہی ناگفتہ

بہ حالات میں گذرتی ہے، شراب وکباب ان کے پاس، شباب ان کے پاس اور اسی طرح تمام کی تمام برائیاں، خباثتیں ان کے پاس، تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو ہمارے اوپر کیوں مسلط کر رہا ہے؟

ان آیات میں اس کا جواب دے دیا گیا کہ جب ماننے والے بندے نہ ماننے والوں کے جیسے ہو جاتے ہیں، رحم جن کا کام، وہ ظلم پر اتر آتے ہیں، نافرمانی میں مبتلا ہوتے ہیں، بے حیائی اور فحش ان کا شیوہ بن جاتا ہے، گانے بجانے میں لگ جاتے ہیں، نمازیں چھوڑتے اور روزوں کو پامال کرتے ہیں، وہ بھی شراب و کباب کی مجلسوں کو گرم کرنے لگتے ہیں، تو ان پر اللہ تعالیٰ خود کافروں اور بددینوں کو مسلط کر دیتے ہیں، جو ان ماننے والوں پر ظلم وتشدد کرتے ہیں، ان کی مسجدوں اور مدرسوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔

گویا اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اے میرے بندو! میں نے تم کو ایمان دیا، کتاب دی، علم دیا، دین کا فہم دیا؛ مگر تم نے دین کو ملے کر دین کو برباد کیا، دین کا کھواڑ کیا، میرے دین سے لاپروائی کی، تو لو اَب میں میرے نافرمانوں کو تم پر مسلط کرتا ہوں، جو تمھیں سزا دیں گے۔

اب دیکھو! ایک طرف مسلمان ہیں اور ایک طرف کافر، اب کیا بنی اسرائیل کا یہ سمجھنا درست ہے کہ بھائی! ہم تو انبیا کے طریقے پر ہیں؛ اس لیے کافروں نے ہم پر ظلم کیا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے بہت مقرب بندے ہو گئے ہیں؛ اس لیے ہمارے درجات کی بلندی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہم پر کافروں کو مسلط کر دیا ہے، کیا ان کا یہ سمجھنا درست ہے یا نادرست ہے؟ بالکل نادرست بات ہے؛ اس لیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہاں کہہ دیا کہ تم فساد مچاؤ گے، قتل وغارت گری کرو گے، سرکشی کرو گے اور ایسا ایسا کرو گے، تو تمھارے اوپر ہر دفعہ ظالم بادشاہوں کو مسلط کیا جائے گا،

کافروں کو مسلط کیا جائے گا اور وہ صرف تمھارے جان کے ہی نہیں، مال ہی کے نہیں؛ بل کہ تمھاری مسجدوں تک کے دشمن ہو کر تمھاری مسجدوں تک کو تاخت وتاراج کریں گے، ویران کردیں گے، یہ سب کچھ ہوگا اور جیسے اللہ تعالی نے فرمایا، ویسے ہی واقعہ پیش آیا، بڑی عبرت آموز آیات ہیں یہ غور کرنے والوں کے لیے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر: ''بیان القرآن'' کے اندر ان ہی آیات کی تفسیر کے تحت، بنی اسرائیل پر پیش آنے والے ایسے احوال کی جانچ کرنے کے بعد اور تفحص کرنے کے بعد چھ بڑے بڑے ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے، جو بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے، جو تاریخ میں محفوظ ہیں۔

لیکن یہاں اللہ نے صرف دو واقعات کا ذکر کیا ہے، واقعات تو بہت ہوئے؛ لیکن یہاں تذکرہ صرف دو واقعات کا ہوا، یہ دو واقعات دو زمانوں میں پیش آئے۔

بنی اسرائیل کے دو واقعات - حدیث کی روشنی میں

ان دو واقعات کا ذکر حدیث کے اندر آتا ہے، وہ حدیث امام قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کی ہے، وہ حدیث یہ ہے:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظیم القدر مسجد ہے، آپ نے فرمایا کہ وہ دنیا کے سب گھروں میں ایک ممتاز عظمت والا گھر ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان بن داود علیہما السلام کے لیے سونے چاندی، ہیرے جواہرات، یاقوت وزمرد سے بنایا تھا اور یہ اس طرح ہوا کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی، تو حق تعالیٰ نے جنات کو ان کے تابع کردیا، جنات نے یہ تمام جواہرات اور سونے وچاندی کو جمع کرکے اس سے مسجد بنائی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ

کہتے ہیں میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! پھر بیت المقدس سے یہ سونا چاندی، ہیرے جواہرات کہاں چلے گئے؟ اور کس طرح چلے گئے؟ تو رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا ہو گئے، حضرات انبیا علیہم السلام کو قتل کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ''بخت نصر'' بادشاہ کو مسلط کر دیا، جو مجوسی کافر بادشاہ تھا، اس نے سات سو برس بیت المقدس پر حکومت کی اور قرآنِ کریم میں جو فرمایا گیا کہ ہم نے سخت جنگ جو بادشاہ کو بنی اسرائیل پر مسلط کیا، اس سے یہی مراد ہے۔

پھر بخت نصر کا لشکر مسجدِ بیت المقدس میں داخل ہوا، مردوں کو قتل اور عورتوں اور بچوں کو قید کیا، بیت المقدس کے تمام اموال اور سونا چاندی، ہیرے جواہرات کو ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں میں بھر کر لے گیا۔ کتنے؟ ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں میں! اور اپنے ملک: ''بابل'' میں رکھ لیا اور سو برس تک ان بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا کر طرح طرح کی بامشقت خدمت؛ ذلت کے ساتھ ان سے لیتا رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے ملکِ ''فارس'' کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اس کے مقابلے کے لیے کھڑا کر دیا، جس نے ''بابل'' کو فتح کیا اور باقی ماندہ بنی اسرائیل کو بخت نصر کی قید سے آزاد کروالیا اور جتنے اموال وہ بیت المقدس سے لایا تھا، وہ سب ان کو واپس دلوایا اور پہنچا دیا اور پھر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اگر تم پھر نافرمانی کرو گے اور گناہوں کی طرف لوٹ جاؤ گے؛ تو ہم پھر تمھارے ساتھ قید بند کا وہی عذاب دوبارہ لوٹا دیں گے۔

اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم آگے فرماتے ہیں: پھر جب بنی اسرائیل بیت المقدس لوٹ آئے اور سب اموال اور سامان بھی ان کے قبضے میں آ گیا، تو پھر کچھ زمانے کے بعد وہ لوگ معاصی میں اور بد اعمالیوں میں پڑ گئے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ

نے ان پر شاہِ روم: قیصر کو مسلط کر دیا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کہتے ہیں اس سے یہی مراد ہے، دوسری دفعہ قیصرِ روم بادشاہ روم ان پر مسلط کر دیا گیا، شاہِ روم نے ان لوگوں سے بری و بحری؛ دونوں راستوں سے جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل اور قید کیا اور تمام ان اموال بیت المقدس کو ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں میں لاد کر، واپس لے گیا اور اپنے ''کنیسة الذهب'' کے اندر رکھ دیا اور یہ سب اموال ابھی تک وہیں موجود ہیں اور وہیں رہیں گے؛ یہاں تک کہ حضرت مہدی عَلَیْہِ السَّلَام ان کو وہاں سے ایک لاکھ ستر ہزار کشتیوں میں واپس بیت المقدس لے آئیں گے۔ حدیث پوری ہوگئی۔ (تفسیر الطبري:۴۱/۴۵۸، الدر المنثور:۹/۲۶۰)

ان سب تفصیلات کے بعد، یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ صرف ہمارا مسلمان ہو جانا کافی نہیں ہے؛ بل کہ اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ہم احکامِ شرعیہ کی پوری پابندی کریں، ایمان تو ہو؛ مگر احکامِ شرعیہ کی پابندی نہ ہو؛ بل کہ احکامِ شرعیہ سے روگردانی اور احکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی جاری رہے، تو اللہ تعالیٰ ایسے ہی پریشان کن حالات ہمیشہ لاتے رہتے ہیں، اللہ نے فرمایا ہے:

﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ (الإسراء:۸)

(جب بھی تم کوئی ایسی حرکت کروگے، تو دوبارہ ویسی ہی صورت پیدا ہوگی۔)

آج مسلمان خود اسلام کو نہیں چاہتا

آج یہ صورتِ حال ہے کہ مسلمان خود احکامِ اسلامیہ کا باغی بنا ہوا ہے، چند لوگ ہیں مٹھی بھر، جن کو انگلیوں میں گنا جا سکتا ہے، ان کو چھوڑ کر پوری ملتِ اسلامیہ کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام پر چلنے میں اپنے لیے کوئی اعزاز، کوئی عزت نہیں سمجھتی؛ بل کہ اس پر چلنا، ان کے لیے مشکل سمجھا جا رہا ہے؛ بل کہ اسلام پر چلنے کو اپنے لیے باعث

ذلت سمجھا جارہا ہے؛ بے شمار لوگ یہ چاہتےہیں کہ یہ احکام ہم سے اٹھا لیے جائیں، تو زیادہ اچھا ہے، داڑھی کی سنت کو ذلت کا باعث سمجھنا آج عام بات ہے، جبوں اور سنت کے لباس کو اپنی توہین خیال کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، قرآن کی تعلیم کو ذلیل اور حقیر سمجھنے والے بے شمار لوگ اس زمانے میں آپ کو مل جائیں گے، حفظ کرتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر کھلے عام مسلمان کہتا ہے کہ دیکھو اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں، جو ملت اور جو قوم قرآن کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو ذلیل سمجھے یا قرآنِ کریم کی تعلیم کو ذلیل سمجھے اور دنیا کی تعلیم کو اعزاز کی نگاہوں سے دیکھے اور سمجھے کہ اسی میں ہماری عزت ہے، اسی میں ہماری بھلائی ہے، اسی میں ہمارا اعزاز ہے؛ تو کیا اس قوم پر اللہ کی پھٹکار نہیں آئے گی؟ اور یہ اِکادُکا واقعہ نہیں ہے کہ کسی نے کہہ دیا ہو؛ بل کہ عمومی مزاج اس وقت ملت کا یہی بنا ہوا ہے، عمومی مزاج کے اعتبار سے بات ہو رہی ہے، ہاں! چند لوگ ہیں، جو اس سے مستثنیٰ ہیں؛ ورنہ تو عام طور پر صورتِ حال ایسی ہے کہ مسلمان خود اسلام کو نہیں چاہتا، اسلام پر چلنے کو نہیں چاہتا، اسلام پر چلنے کو اعزاز نہیں سمجھتا۔

بعض تو ایسے بھی ہیں کہ جو خود کو مسلمان کہلاتے ہوئے ذلت محسوس کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ایسے ناموں سے پیش کرتے ہیں، جن سے کوئی ان کو مسلمان نہیں سمجھتا، ان کا ڈیل ڈول دیکھو، ان کا لباس و پوشاک دیکھو، ان کا انداز رہن سہن دیکھو، ان کی معاشرت اور تہذیب کو دیکھو، ان کے اخلاق دیکھو، ان کی زبان دیکھو، کسی کی چیز سے وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اردو زبان کو صرف اس لیے کہ اس سے مسلمان ہونا ظاہر ہو جائے گا، چھپاتے ہیں اور انگریزی زبان بول کر سمجھتے ہیں کہ اس میں

اعزاز ہے؛ حالاں کہ اسلام میں انگریزی زبان بھی کوئی بری زبان نہیں ہے، انگریزی بھی اللہ کی زبان ہے، کنڑ بھی اللہ کی زبان ہے، تمل بھی اللہ کی دی ہوئی زبان ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی بھی زبان بولے آدمی؛ لیکن یہاں یہ دیکھو کہ اس آدمی کا نظریہ یہ ہے کہ اپنا مسلمان ہونا ظاہر ہو جائے گا؛ اس لیے اردو نہیں بولتا۔ سوال یہ ہے کہ جب انگریزی زبان ہمارے نزدیک معیوب نہیں؛ تو اردو کیوں معیوب ہو گئی؟ علما، انگریزی کے مخالف نہیں؛ لیکن اس انگریز ذہنیت کے مخالف ہیں، جو اردو زبان کی توہین کرتی ہے اور اردو زبان بولنے کو معیوب سمجھتی ہے اور اردو زبان بولنے والوں کو معیوب سمجھتے ہیں۔

اب بتاؤ! خود شریعت کے محافظ، شریعت کے دشمن بن جائیں، اسلام کے پاسبانِ اسلام سے نفرت کرنے لگیں؛ تو کیا ہم پر ظالموں کو اللہ مسلط نہیں کریں گے؟

مصر میں ''مرسی'' کی حکومت آئی اور ''مرسی'' اور ان کے حامیوں نے یہ چاہا کہ اسلام کا بول بالا ہو اور اسلام کو اعزاز ملے اور اس سلسلے میں ان کی طرف سے کچھ جد و جہد بھی کی گئی؛ لیکن وہاں کی عمومی جو صورتِ حال تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اسلام کو نہیں چاہتے تھے، اسی طرح کسی بھی ملک کی آپ صورتِ حال اس وقت اٹھا کر دیکھ لو، یہی صورتِ حال ملے گی۔

دنیا میں نیک لوگ بھی تو ہیں؟

دنیا میں مختلف علاقوں میں کچھ کچھ نیک لوگ اسلام کی ترقی کی کوشش کرتے ہیں، اگرچہ وہ مٹھی بھر ہوتے ہیں اور اس کوشش میں جب ان کو ناکامی ہوتی ہے، تو عام طور پر لوگ ایک سوال یہ کرتے ہیں اور ذہنوں میں یہ بات شدت سے کھٹکتی ہے، کہ ارے! یہ تو اللہ کے بڑے لاڈلے بندے تھے، یہ اسلام کا بول بالا چاہتے تھے، یہ

اسلام کو عزت دینا چاہتے تھے، اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے، تو پھر مٹھی بھر ہونے کے باوجود ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ طاقت وقوت کیوں نہیں دی، جو بدر کے مسلمانوں کو طاقت وقوت دی تھی، جو مٹھی بھر ہی تھے؟ یہ سوال پیدا ہوتا ہے؛ لیکن بہت دقیق فرق ہے یہاں اور وہ فی الواقع دقیق تو نہیں ہے؛ لیکن ہم لوگوں کے لیے دقیق ہو گیا ہے؛ ورنہ تو وہ بالکل واضح ہے۔

وہ فرق یہ ہے کہ جنگِ بدر میں مسلمان سب کے سب ایک تھے، سب کے سب پکے مسلمان تھے، ان میں کوئی کچا تھا؟ نہیں، اگر چہ وہ مٹھی بھر تھے؛ لیکن وہ مٹھی بھر سب کے سب پکے مسلمان تھے، ان کے مقابلے میں جتنے تھے وہ سب کے سب کافر تھے، ایک طرف سب کافر اور ایک طرف سب کے سب مسلمان؛ لیکن یہاں کی صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔

یہاں جتنے ہیں، ان میں کچھ مسلمان وہ ہیں؛ جو اسلام کی سربلندی چاہ رہے ہیں اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں، جو یہ نہیں چاہ رہے ہیں کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو، وہ چاہتے ہیں کہ یہاں ننگا ناچ ہوتا رہے، ڈانس کی محفلیں جمتی رہیں، شراب نوشی کے اڈے قائم رہیں، جوئے کے اڈے جاری ساری رہیں اور طوائف کا سلسلہ قائم رہے اور عیش وعشرت کی ہماری یہ زندگی باقی رہے۔

اب یہ مٹھی بھر لوگ ہیں، تو یہ مٹھی بھر لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس لیے کام یابی نہیں دیتا، کہ اتنے سارے جو مسلمان ہیں، وہ نہیں چاہ رہے ہیں کہ اسلام یہاں زندہ ہو، یہاں وہ صورت پیش آئے گی، جو ابھی آپ کے سامنے قرآن سے دی گئی کہ ظالموں کو مسلط کیا جائے گا۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بنی اسرائیل کے ان دو واقعات میں، جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، ان کے زمانے کے بعض انبیا زندہ بھی تھے، جب بخت نصر

بادشاہ کا واقعہ پیش آیا تھا، تو اس واقعے میں یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں حضرت عزیر علیہ السلام زندہ تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی اس نے قید کرلیا تھا۔ کوئی سوال کرسکتا ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام تو اللہ کے پیغمبر تھے، وہ کیسے قید ہوگئے؟ تو بات وہی ہے، جو میں سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ یہاں اور وہاں میں بہت فرق ہے، اس فرق کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں ایک طرف کافر اور ایک طرف مسلمان والا معاملہ نہیں ہے، دونوں طرف اسلام والے ہیں؛ لیکن ایک وہ ہیں، جو اسلام کو سر بلند دیکھنا چاہتے ہیں اور جم غفیر وہ ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

پاکستان کے اسلام کا حال

پڑوس ملک کی مثال آپ کے سامنے ہے کہ کس بنیاد پر وہ قائم کیا گیا تھا؟ اور ہندوستان سے وہ کس بنیاد پر الگ کیا گیا تھا؟ اس زمانے میں نعرے لگائے جاتے تھے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' یعنی ''پاکستان'' بولنا اور ''لا الہ الا اللہ'' بولنا ایک ہی ہے، وہاں اللہ کی حکومت قائم ہوگی، نبی کی شریعت نافذ ہوگی، اللہ کا قانون چلے گا، پاکستان کا مطلب ہی یہ بیان کرتے تھے؛ لیکن کیا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوا؟ نہیں ہوا، کیوں نہیں ہوا؟ اس لیے نہیں ہوا کہ مٹھی بھر لوگ تو یہ چاہ رہے تھے کہ ''پاکستان کا مطلب: لا الہ الا اللہ'' مگر جمہور اہلِ اسلام یہ نہیں چاہتے تھے اور وہ آج بھی نہیں چاہتے کہ یہاں اسلام کا نفاذ ہو، کئی سال پہلے کا واقعہ میں آپ کو بتلاؤں کہ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے بڑے بھائی حضرت اقدس مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم یہاں بنگلور تشریف لائے تھے، ایک سمینار تھا ''دار العلوم سبیل الرشاد'' میں، اس وقت ایک نجی مجلس جمی، جس میں حضرت بیان فرمارہے تھے، اسی درمیان پاکستان کے حال واحوال کے تعلق سے کچھ

لوگ حضرت سے سوال و جواب کرنے لگے۔

اچانک مولانا نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ مجھے بتائیں کہ اگر پاکستان کی حکومت یہ قانون پاس کردے کہ جو آدمی بھی پنج وقتہ نماز پڑھے گا؛ ہر نماز پر دس روپئے اُسے دیے جائیں گے، ہر مسجد میں ایک کاؤنٹر قائم کیا جائے گا اور ہر نمازی کو اس کاؤنٹر کے ذریعے دس دس روپے دیے جائیں گے؛ لہٰذا جو آدمی بھی پنج وقتہ نماز پڑھے گا، اس کی پاکٹ میں پچاس روپے روزانہ پڑ جائیں گے، تو مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگ مجھے بتائیں کہ اگر پاکستان کی حکومت یہ قانون پاس کردے اور اس طرح کا اعلان کردے، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ سوفی صد وہاں نمازی تیار ہو جائیں گے؟ یا کیا صورتِ حال ہوگی؟ جتنے لوگ بیٹھے تھے سب کی زبان پر یہی تھا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کثیر تعداد میں لوگ نماز پڑھنا شروع کردیں گے، کم سے کم اس بہانے اور اس لالچ میں کہ بھائی پیسے ملیں گے، یہ ہمارا اندازہ ہے، مولانا نے فرمایا کہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں آپ سے زیادہ وہاں کے لوگوں کے احوال سے واقف ہوں، وہاں کے لوگوں کی نفسیات سے واقف ہوں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر حکومتِ پاکستان نے یہ اعلان کیا، تو اسی دن سے اس حکومت کی مخالفت شروع کردیں گے اور کہیں گے کہ اس قانون کو اٹھاؤ اور اس قانون کو اٹھانے تک کسی کو قرار نہیں آئے گا۔ یہ حضرت کے الفاظ ہیں مجھے یاد ہے۔

یہ واقعہ میرے خیال سے اب سے پچیس سال پہلے کا ہے، اتنے سال پہلے دس روپے کی، جو قدر و قیمت تھی، اس کا بھی آپ اندازہ کرلیں، آج دس روپے کی جو حیثیت ہے، اس زمانے میں دس روپے کی یہ حیثیت نہیں تھی، اس زمانے کے دس روپے کی حیثیت آج کے سو روپے سے کم نہیں ہوسکتی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نماز پر سو روپے اور پنج وقتہ نمازی کو پانچ سو روپے دیے جائیں گے۔

تو یہ ہے پاکستان کا اسلام اور وہاں کے مسلمانوں کی صورتِ حال! تو بھائی اندازہ کرو، جہاں اسلامی حکومتوں کے نام سے اسلامی حکومتیں قائم ہیں، وہاں اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کی آج تک بحث ہورہی ہے کہ اللہ کا قانون نافذ ہونا چاہیے کہ نہیں ہونا چاہیے؟ اسی طرح جتنے مسلم ملک ہیں، کسی بھی ملک کے اندر مکمل اسلامی احکام کہیں بھی نافذ نہیں ہیں، سعودی عربیہ کے اندر بھی نافذ نہیں ہیں، یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت ہے، مسلم حکومت تو ہوسکتی ہے وہ؛ مگر اسلامی حکومت نہیں ہے، تو ایسی صورتِ حال میں کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ کی رحمت آجائے گی؟ یہاں وہی صورتِ حال پیش آئے گی، جس کی عکاسی قرآن کی مذکورہ آیت کررہی ہے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگیا کہ آج جو صورتِ حال مسلمانوں کی ہے، وہ دراصل ہماری بدبختیوں، ہماری بداعمالیوں، ہماری بداخلاقیوں، ہماری بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، اللہ کے قانون سے بغاوت وسرکشی اور اللہ کے قانون سے دوری اور اللہ کے قانون سے استہزا وتمسخر کا نتیجہ ہے، جس کے نتیجے میں یہ صورتِ حال پیش آرہی ہے، اس صورتِ حال کو اگر بدلنا ہے؛ تو ہمیں اللہ کے قانون کو یاد کرلینا چاہیے کہ اگر تم بدلوگے؛ تو اللہ کا قانون بدلے گا، اگر نہیں بدلوگے؛ تو نہیں بدلے گا۔

اللہ سے دعا کریں کہ اللہ ہمارے حالات بدلے، حالت کب بدلیں گے؟ جب ہم خود کو بدلیں گے، اپنے ظاہر وباطن کو بدلیں گے، جب تک یہ نہیں ہوگا، اس وقت تک حالات میں تبدیلی کی کوئی امید نہیں ہے، اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

شیخ سے استفادے کا طریقہ

چار شرطیں لازمی ہیں استفاضے کے لیے
اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد
یہ مقفٰی قول ہے، سنگین بھی رنگین بھی
حضرت مرشد کا یہ ارشاد، رکھ تا عمر یاد

(خواجہ مجذوب رحمہ اللہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ سے استفادے کا طریقہ

الحمد لله و كفىٰ وسلام علىٰ عباده الذين الصطفىٰ ، أما بعد:

فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم:

﴿ أَلاَ إِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لاَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُوْنَ، الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْايَتَّقُوْنَ ﴾ (يونس :٦٢-٦٣)

صدق الله العظيم!

محترم بھائیو!

آج کل یہ دیکھا جار ہا ہے کہ بہت سے لوگ اہل اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہے، اصلاح وبیعت کا رجحان معاشرے میں بڑھ رہا ہے، لوگ اپنی اصلاح کے لیے مختلف شیوخ سے رابطہ کر رہے ہیں۔

الحمدللہ! یہ بڑی خوش آئند بات ہے؛ احقر کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ لوگوں کا رجحان اصلاحی نظام کی جانب بڑھ رہا ہے؛ مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ لوگوں کو اپنے شیخ سے استفادے کا طریقہ نہیں معلوم؛ لہٰذا اس بات کی بھی شدید ضرورت ہے کہ ہمیں اصلاح کرانے اور شیخ سے استفادہ کرنے کا مقصد وطریقہ بھی معلوم ہو، اصلاحی نظام کے آداب سے پوری واقفیت ہو، شیخ سے

استفادے کے اصول وضوابط بھی ہمارے اکابر نے ہمیں سکھائے اور بتائے ہیں، ہم انھیں اکابر کے بتائے ہوئے اصولوں پر گامزن رہیں گے، تو ہمیں اس اصلاحی نظام وتعلق سے فائدہ ہوگا؛ ورنہ کئی سال تعلق رکھنے کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس لیے ہمیں یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ہم جب کسی شیخ سے بیعت ہوتے ہیں، تو کیوں ہوتے ہیں؟ کسی سے تعلق قائم کرتے ہیں؛ تو تعلق قائم کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ آپ کے سامنے ان اصولوں کو بیان کروں؛ تاکہ ہم سب ان کی روشنی میں اپنی اصلاح صحیح طور پر کرا سکیں اور اس اصلاحی نظام سے مکمل فائدہ اٹھا سکیں۔

نیتِ فاسدہ کے ساتھ بزرگوں کے پاس سے کچھ نہیں ملتا

سالکِ راہِ حق کے لیے سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ اپنی نیت کو درست کرے اور اس میں اخلاص پیدا کرے، یہ تصحیحِ نیت بہت ضروری ہے؛ اس لیے کہ تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

چناں چہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ. » (البخاري:۱،مسلم:۱۹۰۷)

(تمام اعمال کا دراومدار نیتوں پر ہے۔)

لہٰذا دین پر اور اللہ کے راستے میں چلنے سے ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہونا چاہیے؛ بس یہی مقصد ہونا چاہیے کہ اللہ کی رضا وخوش نودی مل جائے، اللہ خوش ہو جائیں۔

اسی طرح اصلاح کی خاطر، جب بزرگوں سے بیعت ہونے کا خیال آئے، تو

سب سے پہلے ہمیں یہ نیت کرنا ہے کہ مجھے اپنے شیخ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اللہ کی محبت حاصل کرنا ہے، اللہ کی معرفت اپنے دل میں پیدا کرنا ہے، فانی دنیا کی محبت دل سے نکال کر آخرت کی طلب وجستجو میں زندگی بسر کرنا ہے۔

اس نیت سے آدمی راہِ سلوک کی منزلیں کرے، تو ان شاء اللہ ایک دن وہ اپنے مقصد میں کام یاب وکام ران ہوگا اور منزل تک اس کی رسائی ضرور ہوگی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں یعنی اچھائی کرنے والوں کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔

لیکن بہت سے لوگ نیت ہی خراب کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے سالوں تعلق رکھنے کے باوجود ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔

بعض لوگ اس خیال سے کسی شیخ سے بیعت ہوتے ہیں کہ ہمارا کاروبار ٹھیک ہو جائے، بیوپار اچھا چلنے لگے، نقصان جو ہو رہا ہے اس نقصان سے ہم محفوظ ہو جائیں اور جو اِدھر اُدھر سے پریشانیاں آ رہی ہیں، وہ ختم ہو جائیں، مال میں اضافہ ہو جائے، دکان اچھی چلنے لگے؛ بل کہ بعض لوگ اتنی گھٹیا نیت کرتے ہیں کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اور میں یہ سب ہوائی باتیں نہیں کر رہا ہوں؛ بل کہ یہ سب واقعات ہیں، ان ہی کی روشنی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں میں اسی طرح کا ذہن ہے۔

تعویذ سیکھنے کے لیے اللہ والے کی خدمت میں جانا

بہت پرانی بات ہے کہ ایک صاحب جن کو میں پہچانتا تھا، ایک بار مجھ سے ملنے آئے اور کہا کہ میں حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں اور ان کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں، تو میں نے کہا کہ ضرور جائیں، اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اتنے بڑے اللہ کے ولی کے

پاس آپ جائیں اور رہیں اور استفادہ کریں؟ جن کی زیارت کے لیے لوگ مشتاق رہتے ہیں، جن کی صحبت حاصل کرنے کے لیے لوگ ترس جاتے ہیں؛ مگر بہت سے لوگوں کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی، آپ نے یہ قدم اٹھایا ہے، تو بڑھائیے قدم! خیر اس کے بعد وہ صاحب حضرت کی خدمت میں گئے، پھر ایک ماہ کے بعد جب واپس آئے، تو واپسی پر بھی مجھ سے ملاقات کے لیے آئے، تو میں نے پوچھا کہ حضرت کی خدمت میں گئے تھے؟ کہا کہ جی ہاں! گیا تھا اور ایک ماہ رہ کر آیا ہوں۔ میں نے پوچھا کیسا رہا وہاں کا سفر اور وہاں کی صحبتیں، حضرت والا کے ساتھ معیت؟ تو کہنے لگے کہ گیا تو تھا؛ مگر میرا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا مقصد کیا تھا، جو کہ حاصل نہیں ہوا؟ کہنے لگے کہ میرا مقصد یہ تھا کہ حضرت کی صحبت میں رہ کر ذرا تعویذ گنڈے سیکھ کر آجاؤں؛ کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ حضرت بہت بڑے عامل ہیں؛ لیکن ایسا کوئی موقع ہی مجھے نہیں ملا؛ اس لیے واپس ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اے اللہ کے بندے! اتنی دور کا آپ نے سفر کیا اور ایک اللہ کے سچے ولی کے پاس آپ گئے اور اتنے بڑے شیخ کی خدمت میں گئے، وہاں آپ یہ نیت لے کے جاتے کہ میری اصلاح ہو جائے اور میرا دل صاف ہو جائے اور میں اس قابل بن جاؤں کہ اللہ کو منھ دکھا سکوں، میری آخرت بن جائے، مجھے معرفت کا کچھ حصہ مل جائے، اللہ کی محبت مل جائے، یہ نیتیں لے کر آپ جاتے اور ان کی صحبت میں بیٹھتے، تو آپ کو بہت کچھ مل جاتا، حضرت کی شخصیت تعویذ گنڈے سکھانے کی نہیں تھی کچھ اور سکھانے کی تھی۔

تو بہ ہر حال بتانا یہ ہے کہ بزرگوں کو سمجھنا اور ان سے کیسے استفادہ کرنا ہے، کن چیزوں میں ان سے استفادہ کرنا ہے؟ یہ سب بہت ضروری سیکھنے کی باتیں ہیں، اب لوگ کچھ کا کچھ کرنے لگے ہیں، سنار کے پاس جائیں، لوہار سمجھ کر تو کیا ملے گا بے چارے کو؟ اسی طرح اولیاء اللہ کے پاس جائیں، تو ان کے پاس جانے کی نیت ہو

اپنی روحانیت کی ترقی، اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح، اپنے اخلاق کی اصلاح، اپنی معاشرت کی اصلاح، اللہ کا خوف وخشیت اور تقویٰ اپنے اندر پیدا کرنا، یہ سب چیزیں لینے کے لیے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں۔ جب نیت صاف ہوگی اور اسی صاف دل کے ساتھ ہم بزرگوں کے پاس جائیں گے، بیٹھیں گے، اٹھیں گے، تو اس وقت ہمیں ان کی ہر ہر ادا سے ہر کام سے کچھ نہ کچھ استفادے کا موقع ملے گا۔

وہ صاحب کیوں ایک اتنے بڑے اللہ کے ولی کے پاس گئے؟ تعویذ سیکھنے کے لیے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا اس آدمی پر اور میں نے کہا کہ آپ کا پورا سفر بےکار ہوا، اگر تعویذ گنڈا ہی سیکھنا تھا، تو نہ جانے بنگلور میں ہی کتنی جگہیں تھیں، کہیں بھی سیکھ لیتے، اسے یہاں چھوڑ کر وہاں تک کا سفر بے فائدہ اور فضول کیا، یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ بزرگوں سے کیا حاصل کیا جاتا ہے، دیکھیے اس میں کس قدر نیت کا فساد ہے؟! نیتِ فاسدہ کے ساتھ بزرگوں کے پاس جائے گا، تو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

ایک اہم حدیث کا اشارہ

اس جانب ایک حدیث میں اشارہ ملتا ہے، وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلاوَةَ الْإِيْمَانِ : أَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَ أَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءُ لاَ يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ ، وَأَنْ يَّكْرَهَ أَنْ يَّعُوْدَ إِلٰى الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ . »

(البخاري:١٦، مسلم:١٧٤، الترمذي:٢٦٢٤، أحمد:١٢٠٢١، ابن حبان:٢٣٨)

(تین چیزیں ہیں، جس میں بھی وہ پائی جائیں، اسے ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی: ایک یہ کہ وہ اللہ ورسول کو باقی سب چیزوں سے زیادہ محبوب رکھے، دوسرے یہ کہ وہ کسی بندے سے صرف اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور تیسرے یہ کہ وہ کفر میں جانے کو ایسا ہی برا سمجھے، جیسے آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔)

اس حدیث میں اس جملے پر غور کریں: « وَ أَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءُ لاَ يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ » (وہ کسی بندے سے صرف اللہ ہی کے لیے محبت کرے۔) یعنی جو بندہ کسی اللہ والے سے محبت کرتا ہے؛ مگر کیوں؟ اس لیے کہ صرف اللہ کو پانا چاہتا ہے، کوئی اور اس کا مقصد نہیں ہوتا، تو اس کو یہ حلاوتِ ایمانی نصیب ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ والوں کے پاس جانے آنے، تعلق ومحبت رکھنے، ان کی صحبت ومعیت پانے کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور خوش نودی، اللہ کی معرفت ومحبت ہونا چاہیے، کوئی دنیوی غرض سے اللہ والوں کے پاس جائے گا، تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

شیخ سے مستقل رابطہ رکھیں

اصلاح کے لیے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اپنے شیخ سے مستقل رابطہ اور اس کے لیے مستقل تگ ودو کی ضرورت ہے، جب تک مستقل رابطہ اور تگ ودو نہ ہو، اس وقت تک اصلاح نہیں ہوتی؛ باطنی اصلاح کا نظام بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ جسم کے علاج کے لیے طبِ ظاہری کا سلسلہ ونظام ہے۔ ظاہری وجسمانی بیماری آتی ہے، تو ڈاکٹر سے رابطہ ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے علاج ومعالجہ کے لیے مستقل محنت شروع ہو جاتی ہے، دوائی کھائی جاتی ہے، مشورہ لیا جاتا ہے اور کبھی انجکشن لیا جاتا ہے اور کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر آپریشن کیا جاتا ہے، ان سارے ہی مراحل سے

گذرنے کے بعد انسان کو صحت نصیب ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی سالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ سے مستقل رابطہ رکھے اور وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں، ان کی مجالس میں حاضر ہوتا رہے، اپنے احوال کی برابر اطلاع کرے اور ان کے مشورے پر عمل کرتا رہے اور اس کے پیچھے محنت ومجاہدہ ہو، جب اس طرح آدمی اپنی اصلاح کے لیے مستقل لگا رہتا ہے، تب جا کر اصلاح ہوتی ہے؛ لیکن اس میں بھی آج کل بڑی کوتاہی ہے کہ لوگ بیعت تو ہو جاتے ہیں، پھر غائب ہو جاتے ہیں، سالوں بعد نظر آتے ہیں، عرصے بعد نظر آتے ہیں، اس طرح اصلاح نہیں، ایسی بیعت سے فائدہ مکمل نہیں ہوتا۔

حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ فرمایا کرتے تھے کہ اس بھروسے نہ رہنا کہ شیخ کو کشف ہو جائے گا، شیخ خود معلوم کر لیں گے اپنے کشف سے اور ہماری اصلاح کر دیں گے، حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ فرمایا کرتے تھے کہ نہیں؛ بل کہ سالک ومرید خود شیخ کو بتائے اپنی بیماری کہ میرے اندر یہ یہ بیماریاں ہیں۔

شیخ کو کشف ہونا ضروری نہیں ہے، بہت سارے اہل اللہ ایسے ہیں کہ ان کو پوری زندگی میں ایک بار بھی کشف نہیں ہوتا، پھر بھی وہ بزرگ ہی ہیں، کشف کوئی معیار بزرگی نہیں ہے۔ حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کشف تو گدھوں کو بھی ہوتا ہے اور دلیل میں یہ کہتے تھے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ قبرستان میں مُردوں کو جو عذاب ہوتا ہے، وہ ساری مخلوقات کو سنائی دیتا ہے؛ لیکن جنات اور انسانوں کو سنائی نہیں دیتا۔

(البخاري:۱۳۳۹، أبو داود:۴۷۵۵، مسند أحمد:۱۸۶۳۷)

دیکھو! انسان کو تو نظر نہیں آ رہا؛ لیکن گدھوں کو نظر آ رہا ہے، تو دیکھو گدھوں کو کشف ہو رہا ہے، کتوں کو کشف ہو رہا ہے؛ مگر انسان کو نہیں ہو رہا ہے۔

الغرض کشف کا ہونا لازم نہیں؛ بل کہ ایسے بہت سے بزرگانِ دین ہیں، جن کو کشف نہیں ہوتا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سے بزرگوں کو اللہ بتا دیتے ہیں، دل پر اللہ منکشف کر دیتے ہیں؛ لیکن ہر جگہ ضروری نہیں ہے۔

لہٰذا سالکین کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے شیخ کی مجلس میں جائیں، ان کے پاس رہیں اور ان کو اپنے حالات بتائیں اور اصلاح لیتے رہیں۔

''واٹس آیپ'' سے اصلاح وخلافت

شیخ سے رابطہ نہ ہو، نہ ان کی مجالس میں جانا ہو، نہ صحبت میسر ہو، نہ اصلاح کرائیں اور کرائیں ل تو بھی اپنی برائیوں کی نہیں، صرف وظائف کی، تو کہاں سے اصلاح ہوگی؟

ایک صاحب ابھی قریب میں مجھے سنا رہے تھے کہ ان کو پاکستان کے ایک بزرگ نے خلافت دی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ پاکستان گئے تھے ان کی خدمت میں؟ تو وہ کہنے لگے کہ نہیں، واٹس ایپ پر ہی پورا کام ہو گیا۔

اللہ اکبر! سوچنے کی بات ہے، غور وفکر کی بات ہے کہ جب شیخ کے پاس گیا ہی نہیں، نہ اپنا عمل بتایا، نہ اپنا اخلاق و کردار بتایا، نہ کچھ کیا اور خلافت مل گئی؟ خلافت ہے یا تماشہ ہے؟

بھائیو! ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ اصلاحی نظام کوئی کھیل نہیں ہے، تماشہ نہیں ہے، یوں سمجھیے کہ ایک آدمی کو کار چلانا سیکھنا ہے، تو وہ اس کے لیے کسی سے استفادہ کرتا

ہے، کار چلاتا ہے، کسی کو چلا کر دکھاتا ہے، تب جا کر اس کی اصلاح ہوتی ہے، جب کار چلانے کے لیے بھی ہمیں سیکھنا پڑتا ہے؛ تو سوچیے کہ دین کی گاڑی چلانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ تو دین کی گاڑی ہے، جو اللہ تک پہنچانے والی گاڑی ہے۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں جسم دیا ہے اور اس میں بہت ساری خوبیاں رکھی ہیں، کمالات رکھے ہیں، بہت سی استعدادیں رکھی ہیں، یہ سب یوں سمجھو کہ اللہ نے ہمیں ایک سواری دی ہے، اس سواری میں بیٹھ کر ہمیں یہ سواری چلانا ہے، آنکھ کو چلانا ہے، زبان کو چلانا ہے، ہاتھ اور پیر کو چلانا ہے، اپنے دل کی اندر کی قوتوں استعمال میں لانا ہے، صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے، دماغ کے اندر کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے، ان کو لے کر چلانا ہے اور چلاتے چلاتے کہاں پہنچنا ہے؟ اللہ کے دربار میں۔

ان سب چیزوں کو سنبھالنا ظاہر بات ہے کہ کیا کوئی معمولی کام ہے؟ بہت اہم کام ہے، بہت ضروری کام ہے، اس کو سنبھال سنبھال کر اللہ تک پہنچا جا سکتا ہے، کوئی کھیل نہیں ہے، کوئی تماشہ نہیں ہے؛ بھائیو! یہ بھی ایک نظام ہے، اسے بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ، متانت کے ساتھ، بصیرت کے ساتھ، تدبر کے ساتھ لیں اور سیکھیں۔

شیخ کو معمولات کے ساتھ، معاملات بھی بتائیں

اصلاحی نظام اور اصلاحی طریقے سے جڑنے والے سالک کے لیے تیسری اہم بات، جو بہت اہمیت رکھتی ہے: وہ یہ ہے کہ سالک اپنے معمولات کے ساتھ اپنے معاملات کی درستگی کی فکر کرے۔

ایک ہیں معمولات اور ایک ہیں معاملات؛ معمولات جیسے نماز پڑھنا، ذکر کرنا، وظیفے پڑھنا، قرآن کی تلاوت کرنا؛ یہ معمولات میں سے ہیں؛ لیکن ایک اور

چیز ہے، جسے معاملات کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسے رہیں؟ ایک دوسرے کا حق کیسے ادا کریں؟ اس میں مالی معاملات بھی داخل ہیں، اسی طرح اخلاقی اعتبار سے جو معاملات ہیں، وہ بھی داخل ہیں، معاشرتی اعتبار سے جو معاملات ہوتے ہیں، وہ بھی داخل ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک چیز جو معمول کہلاتی ہے، جیسے ذکر واذکار، تسبیحات وظائف؛ ان ساری چیزوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ ایک اصلاح پسند طبیعت کے لیے اور اصلاح چاہنے والے نفس کے لیے بہت ہی اہم اور ضروری یہ ہے کہ وہ معاملات کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھے، خواہ وہ معاملات اپنی معاشرت سے متعلق ہوں یا تجارت وکاروبار اور لین دین سے متعلق ہوں یا اخلاق وکردار سے متعلق ہوں؛ لیکن عام طور پر ان کے اندر کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں؛ بل کہ ایسا لگتا ہے کہ جو لوگ اصلاح پسند ہیں، اصلاح چاہتے ہیں، اصلاح کے طالب ہیں؛ وہ بھی جب اپنے شیوخ کی طرف نگاہ کرتے ہیں، شیوخ سے اپنے تعلقات کو جوڑتے ہیں، تو ان کو صرف اپنے معمولات کے بارے میں بتاتے ہیں: وہ یہ کہتے ہیں کہ ذکر اتنا کر رہا ہوں، تسبیح اتنی پڑھ رہا ہوں، وظیفہ اتنا پڑھ رہا ہوں اور تہجد کی پابندی کر رہا ہوں۔

یہ سب تو بیان کرتے ہیں؛ لیکن کتنے لوگ ہیں، جو یہ بیان کرتے ہیں کہ اخلاق وکردار کا عالم کیا ہے؟ جھوٹ کتنا بولا؟ دھوکہ کس قدر دیا؟ چغلیاں کتنی کھائیں؟ غیبتیں کتنی کیں؟ لوگوں کے ساتھ گڑبڑ کتنی کی؟ اور بے تحاشہ بکواس کتنا کیا ہے؟ لوگوں کے ساتھ بے کار کی لڑائیاں اور جھگڑے کتنے کیے؟ غصہ کتنا کیا؟ بیوی کے ساتھ کیسا رہا؟ ماں باپ کا حق کتنا ادا کیا؟ رشتہ داروں کے ساتھ کیا حال ہے؟ بیوپار میں سچ کا کہاں تک لحاظ کیا؟ کمائی میں حلال وحرام کی تمیز کس قدر کی؟ یہ بتاتا کہ میرے اندر اتنا غصہ ہے، میں بیوی کے ساتھ ایسا رہتا ہوں، بچوں کے ساتھ ایسا رہتا

ہوں، رشتے داروں کے ساتھ ایسی بدسلوکی کرتا ہوں، پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں رکھتا ہوں، بیوی کے ساتھ بہت ہی ناانصافیاں کرتا ہوں اور لوگوں سے جب لین دین کرتا ہوں، تو صحیح نہیں کرتا وغیرہ۔ یہ ہے اصلاح کروانے کا طریقہ، اصلاح صرف یہ نہیں ہے کہ تسبیح پڑھ لیں، وظیفہ پڑھ لیں۔

یاد رکھیں! جب تک معاملات سے شیخ کو مطلع نہیں کریں گے، اصلاح نہیں ہوسکتی اور شیخ کو کسی نے صرف اپنے وظائف و اوراد، تسبیحات و تلاوت، نماز تہجد ونوافل کے بارے میں بتایا اور شیخ کوئی عالم الغیب نہیں ہوتا: اس لیے اس نے کسی کو خلافت دے دی، یہ خلافت معتبر نہیں ہوگی؛ کیوں کہ معاملہ اللہ سے ہے۔

مصلے پر بیٹھ کر سودی لین دین کرنے والے عابد کا واقعہ

ایک قصہ یاد آ گیا، حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ایک صاحب تھے، وہ بعد نمازِ فجر مسجد ہی میں بیٹھ کر وظائف پڑھا کرتے تھے اور اس درمیان کسی سے بات چیت بالکل نہیں کرتے تھے، یعنی وظیفے کے درمیان بات چیت کو حرام سمجھتے تھے؛ حالاں کہ یہ حرام نہیں ہے، ہاں! بے کار خواہ مخواہ کی بات نہ کرے؛ لیکن فرض کیجیے ایک آدمی بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہا ہے اور اچانک کوئی خاص ضرورت پیش آ گئی، کوئی صاحب ملنے کے لیے آ گئے یا کوئی بات کرنا چاہتا ہے، تو ان سے بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کوئی حرج نہیں؛ لیکن بعض جاہل لوگ جائز کاموں سے پرہیز بہت کرتے ہیں، اسی طرح وہ صاحب بھی اسے ناجائز سمجھ کر بالکل کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے؛ لیکن عین اسی وظیفے کے درمیان لوگوں کی ان کے پاس آمد و رفت رہتی تھی اور وہ اسی مصلے پر بیٹھ کر انگلیوں کے اشارے سے کچھ معاملات طے کرتے تھے، وہ تین دکھاتا، یہ چار

دکھاتے، وہ پانچ دکھاتا، تو یہ چھ دکھاتے؛ اس طریقے پر کچھ معاملات طے ہوتے تھے، لوگ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یہ صاحب بات چیت تو بالکل نہیں کرتے؛ لیکن انگلیوں کے اشارے سے نہ جانے کیا بات کرتے ہیں؟ بعد میں جب لوگوں نے اس کی کھوج کی تو پتہ یہ چلا کہ یہ صاحب سودی لین دین کرتے ہیں اور یہ معاملات یہاں طے ہوتے تھے۔

زبان کھولنا حرام اور ہاتھ چلانا اور یہ حرام کاروبار کرنا یہ سب جائز ہوگیا؟ آپ بتایئے کہ یہ وظیفہ کیا کام دے گا؟ وظیفہ اللہ کے لیے ہوتا ہے اور جب وظیفہ اللہ کے لیے ہے، تو اپنی اصلاح بھی اللہ کے لیے ہونا چاہیے: اپنے ظاہر کی، اپنے باطن کی، اپنے اخلاق کی، اپنے کردار کی، اپنی معاشرت کی، اپنے معاملات کی اصلاح؛ یہ سب بھی اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔

اس کے لیے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور اپنی اصلاح کراتے ہیں؛ لیکن اب لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیں تو کچھ نہیں کرنا ہے، بس شیخ کو صرف اتنا بتانا ہے کہ میں اتنا وظیفہ پڑھتا ہوں، میں دس ہزار کا وظیفہ پڑھتا ہوں، میں بیس ہزار کا وظیفہ پڑھتا ہوں، میں اتنا درود شریف پڑھتا ہوں، میں اتنی تلاوت کر لیتا ہوں، میں اتنے پارے پڑھ لیتا ہوں۔

بھائیو! یہ بھی اپنی جگہ ضروری؛ بل کہ بے حد ضروری ہے، اس میں کوئی اشکال واعتراض کی بات نہیں؛ لیکن اشکال واعتراض یہ ہے کہ صرف اسی پر اکتفا کیوں کر لیا جاتا ہے؟ معاملات کی خرابی کی درستگی کی فکر کیوں نہیں کی جاتی؟ اخلاق خراب ہیں، بیوی کے ساتھ معاملہ خراب ہے، لوگوں کے ساتھ معاملات خراب ہیں، اس کی معاشرت کو دیکھو، تو اس میں بے شمار بیماریاں ہیں، عیب پیدا ہوگیا ہے؛

لیکن ان ساری چیزوں سے یہ اندھا ہو کر صرف اس بات پر لگا ہوا ہے کہ شیخ کو یہ بتا رہا ہے کہ میں اتنا اتنا پڑھ لیتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اصلاح کا نہ نظام سمجھا، نہ حقیقت سمجھی۔

صرف ذکر کرنے سے تکبر کا علاج نہیں ہوتا

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ذکر کر لینے سے ساری باطنی بیماریوں کا علاج ہو جائے گا، کسی شیخِ کامل سے علاج کروانے کی ضرورت نہیں، ذکر کی برکت سے تمام بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔ یاد رکھیں کہ صرف ذکر کرنے سے، وظائف پڑھنے سے، عبادات کو انجام دینے سے تکبر، حسد، کینہ، حب جاہ وغیرہ کا علاج نہیں ہوگا، جب تک کہ کسی باطنی بیماریوں کے ماہر شیخ سے علاج نہ کرایا جائے۔

اگر صرف ذکر و عبادت کر لینے سے تکبر کا علاج ہوتا، تو شیطان کا علاج سب سے پہلے ہو جاتا؛ کیوں کہ اس نے تو بڑی عبادت کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ زمین کے چپے چپے پر اس نے سجدہ کیا تھا؛ مگر شیطان میں سب سے بڑی بیماری کیا تھی؟ تکبر ہی نا؟ اللہ کے حکم کو ٹالا اور اللہ کے مقابلے پر آ گیا، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آیت نازل کی ہے:

﴿اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ.﴾ (صٓ: ۷۵)

(کیا تو تکبر کر رہا ہے یا عالین میں سے ہو گیا ہے؟)

تو اس کے اندر تکبر کی بیماری تھی اور یہ تکبر اس کے اندر پل رہا تھا، بڑھ رہا تھا، پھل رہا تھا، پھول رہا تھا اور کون سے زمانے میں یہ پھل پھول رہا تھا؟ جب کہ یہ بڑا

ذاکر تھا، بڑا شاغل تھا، بڑا عبادت گذار تھا، چپے چپے پر اس کے سجدے ہوا کرتے تھے، عین اسی زمانے میں یہ تکبر اس کے اندر بڑھ رہا تھا۔ سمجھے کہ نہیں سمجھے، ہاں! اس کا تکبر ظاہر اس وقت ہوا، جب اللہ نے اسے حکم دیا:

﴿اُسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ﴾ (البقرۃ: ۳۴) (آدم کو سب سجدہ کرو!)

تو وہاں یہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے جب سجدے کا حکم دیا، تو اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا۔ تو کیا تکبر اسی وقت پیدا ہوا؟ نہیں، تکبر پہلے سے تھا، اس تکبر کا اظہار اللہ کے حکم دینے پر ہوا؟ یہ نکتہ سمجھنے کی ضرورت ہے؛ لیکن اس سے پہلے وہ بڑا ذاکر، بڑا شاغل اور بڑا عابد تھا، اتنے طویل زمانے تک اس نے عبادت کی، ذکر واذکار کیا اور اسی زمانے میں اس میں یہ بیماری بھی پل رہی ہے، پھل رہی ہے اور پھول رہی ہے۔

فخر و تکبر پر حضرت حکیم الاسلام رَحِمَہُ اللہُ کا شعر

حالاں کہ "خود کو بڑا سمجھنا" کوئی حقیقت نہیں رکھتا، صرف ایک تخیل و خیالی چیز ہے، خود کو انسان بڑا سمجھتا ہے، واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رَحِمَہُ اللہُ کے دو شعر یاد آ گئے اور آپ نے یہ اشعار اکبر الہ آبادی مرحوم کے دو اشعار پر اسی زمین میں کہے ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
رہ گئی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

اس پر حضرت حکیم الاسلام رَحِمَہُ اللہُ نے اضافہ کیا ہے:

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا — یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد و نوش   یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

الغرض یہ فخر وغرور، یہ تکبر؛ محض ایک تخیل ہے، اس کی بنا پر لوگ خود کو بڑا اور صاحبِ عز و جاہ سمجھتے ہیں، جو کہ ایک بے کار بات ہے۔

اہلِ ذکر میں فخر و کبر کا سبب

یہ بتانا تھا کہ ذکر سے اگر تکبر کی بیماری کا علاج ہو جاتا، تو شیطان کی اصلاح پہلے ہو جاتی؛ لیکن اس کی اصلاح نہیں ہوئی؛ بل کہ میں یہ کہہ دوں کہ بسا اوقات دوسروں کے مقابلے میں یہ تکبر عابدین وذاکرین وشاغلین میں زیادہ ہوتا ہے، تو کوئی غلط نہیں ہے۔ مثلاً ایک آدمی ہے، ذکر نہیں کر رہا ہے، پابندی کے ساتھ نماز بھی نہیں پڑھتا، تہجد وغیرہ تو الگ بات ہے، عام نمازوں میں بھی اس کی پابندی نہیں ہے، تو ایسا آدمی تو خود ہی یہ سمجھتا ہے کہ نہ میں ذکر کرتا ہوں، نہ تہجد پڑھتا ہوں، نہ نماز کی مکمل پابندی ہے؛ اس کی وجہ سے وہ خود اپنے آپ کو کم تر وحقیر سمجھتا ہے؛ لیکن ایک اور صاحب ہیں، جو بڑے ذاکر و شاغل و عابد و تہجد گذار ہیں، اس کے دل میں شیطان یہ ڈالتا ہے کہ تو بہت بڑا عظیم الشان آدمی ہے، تو بہت مقبول ومقرب ہو گیا ہے، تجھ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تو دیکھیے یہاں ذکر سے تکبر پیدا ہوا اور جوں جوں وہ ذکر میں بڑھنے لگا اس کا تکبر بھی بڑھنے لگا، تو یہ ایسا ہو گیا جیسے شیطان، کہ وہ سب سے بڑا ذاکر بھی تھا اور سب سے بڑا متکبر بھی، بڑی عبادت کی تھی اس نے کہ اس زمانے میں اس سے بڑا کوئی عبادت گذار نہیں تھا؛ لیکن تکبر میں بھی اتنا آگے بڑھ گیا کہ اللہ کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو شیطان ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ اس کے ذکر سے، اس کے شغل سے، اس کی عبادت سے، اس کے اعمال سے، اس کی ریاضت

سے، اس کے اندر تکبر پیدا ہو کر بڑھتا رہتا ہے۔

اس کا علاج کیسے کرائے گا؟ یہی نکتہ ہے سمجھانے کا کہ صرف ذکر سے علاج نہیں ہوتا؛ بل کہ اپنے شیخ کو بتانا پڑے گا کہ حضرت میں ذکر کر رہا ہوں، اسی کے ساتھ ساتھ میرے اندر یہ بیماری بڑھ رہی ہے، میں اپنے آپ کو بہت اونچا سمجھ رہا ہوں، برتر سمجھ رہا ہوں، بہت عالی شان سمجھ رہا ہوں اور میں سمجھ رہا ہوں کہ میرے جیسا کوئی نہیں، میرے جیسا عابد کوئی نہیں، میرے جیسا زاہد کوئی نہیں، اب جب وہ بتائے گا؛ تب شیخ بتائے گا کہ میاں! تیرے اندر یہ بیماری ہے اور اس کا علاج یہ ہے، یہ ٹیابلیٹ استعمال کرنا ہے، یہ گولیاں تجھے کھانی ہیں اور گولیوں سے بھی کام نہیں چلا، تو انجکشن لگانا پڑے گا اور اگر اس سے بھی کام نہ ہوا؛ تو آپریشن بھی کرنا پڑے گا، اس طریقے پر اس بیماری کا علاج ہوگا۔

وظائف سے کیا کام لینا ہے؟

اصلاح ایک نظام کا نام ہے، اس کا ایک طریقۂ کار ہے، وظیفہ اس کے لیے معاون و مددگار ضرور ہے، جب آپ قرآنِ پاک کی تلاوت کریں گے، اللہ کا ذکر کریں گے، تہجد کی پابندی کریں گے اور دیگر وظائف کی پابندی کریں گے، تو اس کے ذریعے آپ کو قوت ملے گی، طاقت ملے گی، روشنی ملے گی، نور ملے گا؛ تا کہ آپ اصلاح کے کام کو آگے بڑھائیں؛ لیکن کوئی آدمی روشنی تو لے لے؛ مگر ضرورت کی جگہ اس کا استعمال نہ کرے، تو اس کا فائدہ کیا ہے؟ اس کو چاہیے کہ اس نور سے وہ کام لے، جیسے کسی کو کہیں جانا ہے اور راستہ طے کرنا ہے، تو اس کو قوت بھی چاہیے اور ہمت بھی، روشنی بھی چاہیے اور سواری بھی، اسی طرح یہ عبادات، یہ اذکار، یہ وظائف؛ اللہ تک پہنچنے کے لیے راستہ ہیں، روشنی ہیں، سواری ہیں، اس سے آدمی کو کام لینا چاہیے،

کیا کام؟ اپنے دل کی اصلاح کا کام، میرے دل میں کیا خرابی ہے، ذرا اس روشنی سے دیکھتا، ذکر کی پابندی سے جو روشنی آرہی ہے، اس کے ذریعے سے دیکھتا کہ آنکھوں میں کیا خرابی ہے؟ میری زبان میں کیا خرابی ہے؟ میرے دل میں کیا خرابی ہے؟ میرے ہاتھ پیر میں کیا خرابی ہے؟ میرے معاملات میں کیا خرابی ہے؟ میری معاشرت میں کیا خرابی ہے؟ اور دیگر چیزوں میں کیا خرابی و عیب ہے؟ اس روشنی سے، جو اللہ نے ذکر کی یہ دولت دے دیا ہے، ان سب چیزوں کو دیکھتا اور جہاں جہاں اصلاح کی ضرورت معلوم ہوتی، وہ اپنے شیخ کو جا کر بتاتا، چاہے یہ نہ بتائے کہ میں نے کتنا وظیفہ پڑھا ہے؛ مگر یہ تو جا کر بتائے کہ مجھے کتنے ڈگری غصہ آتا ہے، غصے میں طلاق پر طلاق دے رہا ہے؛ مگر شیخ کو پتہ ہی نہیں ہے، شیخ کو بتاتا ہی نہیں ہے، زندگی میں یہ سب اودھم مچا ہوا ہے؛ مگر اِدھر ذکر پہ ذکر جاری ہے اور اُدھر زندگی میں جو کھلبلی مچی ہوئی ہے، اس کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔

اسی طرح لوگوں کا قرض چڑھا چڑھا کر چھپتا پھر رہا ہے، دینے کا نام نہیں لیتا، دینے کی طاقت تو ہے؛ مگر حبِ دنیا کی وجہ سے اور حرص کی بنا پر ادا کرنا نہیں چاہتا؛ مگر وظیفہ پڑھ رہا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں۔

بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ قرض چڑھا ہوا ہے اور عمرے پر عمرے کیے جارہے ہیں، قرض چڑھا ہوا ہے اور شادیوں میں لاکھوں خرچ کیا جارہا ہے؛ لیکن وظیفہ برابر جاری ہے، اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی، تہجد میں کوئی کمی نہیں ہے، تسبیح ہمیشہ ہاتھ میں ہے، چلتے ہوئے روڈ میں بھی دکھائی دے رہی ہے؛ لیکن بھائیو! اصل چیز جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت تھی، اس سے صرفِ نظر کیا ہوا ہے، تو کیا یہ وظیفہ اسے کچھ کام دے گا؟! لہٰذا ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم صرف اور صرف

اللہ تک پہنچنا چاہتے ہیں اور اللہ تک پہنچنے کا وہ صاف وستھرا راستہ، جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور بزرگوں سے ہم کو ملا، ہم کو اسی طریقے پر چلنا ہے، اپنی مرضی سے کسی چیز کو لے لیا اور کسی کو چھوڑا، کسی چیز پر توجہ دی اور کسی سے نظر کو پھیر لیا، تو اس سے کبھی آپ اللہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

راہِ سلوک میں بھی شیطان خلل انداز

بھائیو! اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اصلاحی نظام کا جو طریقہ ہے، جو لائن ہے، اس میں بھی شیطان اتنا اندر گھس گیا ہے کہ اس لائن والوں کو بھی اس نے نہیں چھوڑا، وہ ہم کو اور آپ کو گم راہ کرتا چلا جا رہا ہے؛ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت، جو یہ عرض کیا جا رہا ہے، یہ بہت ہی اہم ترین بات اور وقت کی اہم ضرورت ہے، اس لائن کی صفائی کی بات ہے، یوں سمجھو کہ ہمارے گھروں میں دشمن گھس گیا ہے، شیطان گھس گیا ہے اور ہمیں اس غفلت میں مبتلا کر دیا ہے کہ اس قدر وظیفہ ہی ہمارے لیے کافی ہے، اگرچہ کہ وظیفہ بھی بہت سے سالک پورا نہیں پڑھتے، یہ الگ بات ہے کہ تھوڑی بہت کسر میں کوئی مضائقے کی بات نہیں؛ لیکن پریشانی اس میں آتی ہے کہ آدمی معاملات ٹھیک طور سے انجام نہیں دیتا ہے، جس کی وجہ سے سالک جہاں تھا، وہیں رہتا ہے، دس سال، بیس سال پہلے جہاں تھا، دس و بیس سال بعد بھی وہیں کھڑا ہے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا، کیوں نہیں بڑھ سکا؟ کیوں کہ غصہ اس کے کنٹرول میں نہیں ہے، حسد اور کینہ اور بغض؛ کچھ بھی اس کے سینے سے نہیں نکلا ہے اور معاملات کی دنیا دیکھو، تو الٹا سیدھا سارا کاروبار جاری وساری ہے، دنیا کی محبت اس کے دل میں بسیرا کیے ہوئے ہے، حرص و لالچ اس کے دل میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے، دوسری طرف وظیفہ بھی برابر جاری ہے، اس طرح شیطان اسے

گم راہ کر رہا ہے اور سالک کو شیطان دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گم راہ کرتا ہے؛ اس لیے کہ یہ سلوک کے راستے میں چل پڑا ہے، کہیں کام یاب نہ ہو جائے، اس اندیشے سے وہ رات دن اس کے پیچھے محنت کرتا ہے، سالک جو بھی عمل کرے گا، شیطان اس عمل کو ضائع کرنے کا منصوبہ بنائے گا، کبھی ریاکاری میں مبتلا کر کے اس کے اعمال کو باطل کرنے کی کوشش کرے گا، کبھی تکبر میں مبتلا کر کے اس کے اعمال برباد کرے گا اور کبھی وظائف ہی کو سب کچھ بتا کر معاملات کی خرابیوں میں مبتلا کرے گا؛ اس لیے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

گناہوں سے بچنا متقی کا کام ہے

صرف تسبیح تو کوئی بھی پڑھ سکتا ہے، بہت سارے لوگ یہ کرتے ہیں؛ اسی لیے حکیم اختر صاحب نور اللہ مرقدہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''صرف نیکیاں کر لینا، اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگوں کا کام ہوتا ہے؛ لیکن گناہوں سے بھی بچ جانا؛ یہ صرف متقین کا کام ہے۔''

(مواعظ)

اس پر غور کریں! کتنا عجیب جملہ ہے؟ یعنی گناہ سے بچے بغیر، برائیوں سے بچے بغیر، صرف نماز، روزہ، ذکر و تسبیح وغیرہ کر لینا؛ یہ تو اچھے اور برے سب کرتے ہیں، دیکھیے چور بھی مسجد میں آتے ہیں؛ مگر نکلتے نکلتے چپل چوری کر لیتے ہیں، تو کیا یہ نمازی نہیں ہے؟ نماز اور چوری دونوں ساتھ ساتھ چل رہی ہے، تو دیکھو نمازی تو ہے وہ؛ لیکن متقی نہیں ہے؛ کیوں کہ متقی ہوتا، تو چوری سے بچتا؛ متقی ہوتا، تو جھوٹ سے بچتا؛ متقی ہوتا، تو غیبت سے بچتا؛ متقی ہوتا، تو چغلی سے بچتا؛ متقی ہوتا، تو دھوکے بازی سے بچتا؛ متقی ہوتا، تو اور جتنے غلط کام ہیں، ان سب سے بچتا؛ یہاں تک کہ میں کہوں

کہ اگر وہ متقی ہوتا، تو غصے سے بھی بچتا اور متقی ہوتا، تو زبان کی فضول بکواس سے بچتا۔
اسی لیے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿اِنْ أَوْلِيَاءُ ہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾[الانفال: ۳۴]

(اللہ کے دوست تو گناہوں سے بچنے والے ہیں۔)

معلوم ہوا کہ سالک کو اگر اللہ سے خصوصی تعلق قائم کرنا ہے، تو وہ وظائف سے نہیں؛ بل کہ غلط کاموں سے بچنے سے ہوگا، متقی بننے سے ہوگا۔ متقیوں کا معیار یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بھی بچتے ہیں، نیکیاں بھی کرتے ہیں، صرف نیکیاں کر لینا اور گناہوں سے نہ بچنا؛ یہ اچھے برے سب کا کام ہے؛ لیکن گناہ سے بچنا، تو صرف متقیوں کا کام ہے۔

خود کو فراموش کر کے دوسروں کی فکر کرنا بھی گم راہی ہے

چوتھی بات، جس کی اصلاح ضروری ہے، وہ یہ کہ عام طور پر جب بیان کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی خامیوں کی اصلاح کریں، برائیوں سے بچیں، گناہوں کو چھوڑیں؛ تو اس موقع پر بہت سارے لوگ اپنے آپ کو دیکھنے، اپنے عیوب پر نظر ڈالنے کے بہ جائے، اپنی اصلاح کی فکر کرنے کے بہ جائے، دوسروں کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں کہ فلاں اس بیماری میں مبتلا ہے، فلاں اس گناہ کا مرتکب ہے۔

یہ بھی ایک غلط بات ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے کہ جب اصلاحی بات کی جاتی ہے، تو لوگ دوسروں پر نگاہِ التفات کرتے ہیں، خود کو فراموش کر بیٹھتے ہیں، بھائیو! یہ جو بات کہی جارہی ہے، وہ دوسروں کو دیکھنے کے لیے نہیں، خود کو دیکھنے کے لیے ہے، اپنے آپ پر نگاہ ڈالیں، اپنے آپ پر غور کریں کہ میں کیسا ہوں؟ میرے اندر یہ بری باتیں کہاں تک ہیں، کہاں تک نہیں؟ اور میں اس میں کہاں تک کھرا

ہوں، کہاں تک کھوٹا؟ یہاں اپنے بارے میں غور کریں، دوسروں کے بارے میں ہرگز غور نہ کریں۔ یہاں ہم بیٹھے ہیں، اپنی اصلاح کے لیے، ہم کسی اور کی اصلاح کے لیے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہر آدمی یہ سوچ کر بیٹھے؛ بل کہ بولنے والا بھی یہ سوچ کر بولے کہ میں اپنی اصلاح کے لیے بول رہا ہوں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جب وعظ کہنا چاہتا ہوں، تو پہلے یہ سوچ لیتا ہوں کہ میرے اندر کون کون سے عیوب ہیں؟ جو عیب میرے اندر ہوتا ہے، میں بیان اسی کے بارے میں کرتا ہوں اور یہ سوچ کر بیان کرتا ہوں کہ میں دیگر لوگوں سے نہیں، اپنے نفس سے خطاب کر رہا ہوں، یہ وعظ کسی اور کو نہیں کر رہا ہوں، اپنے آپ کو کر رہا ہوں، میں اپنے آپ کو سنا رہا ہوں۔

اسی طرح ہم سب کو بھی چاہیے اور یہاں کے ہر ہر فرد کو چاہیے کہ اپنے آپ پر نگاہ ڈالے، دوسروں پر نگاہ نہ ڈالے، دوسروں پر نگاہ ڈالنے سے اپنی اصلاح نہیں ہوتی، اپنے آپ پر نگاہ ڈالنے سے اصلاح ہوتی ہے۔

ایک بار ایک صاحب میرے پاس آئے اور اصلاح کے مقصد سے آئے اور ہمارے جامعہ میں قیام کیا، وہ جب بھی میرے پاس آتے، تو کچھ سوالات کرتے، کیا سوال؟ کبھی پوچھتے کہ ایک صاحب ہیں، وہ ایسا کرتے ہیں، وہ غیبت کرتے ہیں، وہ معاملات میں بڑے کچے ہیں، وہ ایسے ہیں ویسے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ ایسا کرنے والے کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہیے؟ کبھی پوچھتے کہ ایک صاحب نے مجھ سے ایسا برا سلوک کیا، کسی کے بارے میں کہا کہ فلاں صاحب نے مجھے گالی دی۔ میں ایک دو دن تک تو ان کی سنتا رہا، پھر میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی! مجھے یہ نہیں سمجھ میں آیا کہ آپ ان سب لوگوں کی اصلاح کے لیے یہاں آئے ہیں یا اپنی

اصلاح کے لیے آئے ہیں؟ کہنے لگے کہ اپنی اصلاح کے لیے آیا ہوں، میں نے عرض کیا کہ خود کی اصلاح کے لیے آئے، تو آپ نے اپنی تو کوئی خامی وعیب ظاہر نہیں کیا، سب عیوب دوسروں کے بیان کر رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ کسی کے بارے میں کچھ نہ کہیں، اپنے بارے میں کہیں۔

یہ حال ہے لوگوں کا کہ خود کو چھوڑ کر دوسروں کی بات کرتے ہیں؛ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اگر کوئی آدمی برا ہی ہے، تو بھی یوں سمجھے کہ یہ تو مجھے برا معلوم ہو رہا ہے؛ لیکن ممکن ہے کہ یہ اپنے کسی عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بلند مقام پالے اور مجھے میری برائی کی وجہ سے اللہ ذلیل کر دے، مجھے کیا خبر؟ لہٰذا میں اس کی کیا برائی دل میں پالوں؟ اور اپنے بارے میں یہ سوچے کہ میں تو برا ہوں ہی، یہ سوچنا چاہیے؛ لیکن اس کے بہ جائے لوگ دوسرے کی برائی دل میں پالتے ہیں اور اپنی اچھائی، اپنے بارے میں بڑے خوش فہم؛ حالاں کہ آدمی اپنے بارے میں جتنا جانتا ہے دوسرے کے بارے میں اتنا نہیں جانتا، میں اپنے بارے میں جتنا جانتا ہوں، آپ کے بارے میں نہیں جانتا، نہ جان سکتا ہوں؛ لیکن اپنے بارے میں تو معلوم ہے، اپنی برائی خود کو معلوم ہونے کے باوجود میں اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتا ہوں اور آپ کے بارے میں معلوم نہ ہونے کے باوجود آپ کو برا سمجھتا ہوں، یہ مزاج بن گیا ہے، یہ ناجائز ہے؛ لہٰذا بتاؤ شیخ کو کہ مجھے فلاں آدمی سے کینہ ہے، ہر وقت دل اس کے بارے میں برا برا سوچتا رہتا ہے، میں کیا کروں علاج بتائیے؟ یہ بیماری دل میں پیدا ہوگئی، اس کا علاج کیسے کریں؟

مطالعہ بھی اپنی اصلاح کے لیے کرنا چاہیے

ایک صاحب کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے اور وہ ایک مسجد کے خطیب بھی

تھے۔ مجھ سے کتابوں کے مطالعے کے بارے میں مشورہ چاہا، تو میں نے کہا کہ آپ خطبہ دینے کے لیے مطالعہ نہ کریں کہ میں مطالعہ کروں گا اور خطبہ دوں گا، نہیں! بل کہ آپ مطالعہ اپنے لیے کریں اور بعد میں مطالعے کی روشنی میں دل میں جو بات آجائے، اُسے خطبہ میں بیان کر دیں۔

اگر میں مثال کے طور پر کسی کتاب کا مطالعہ کروں اور اس لیے کروں کہ مجھے کہیں بیان کرنا ہے، اپنے لیے نہیں، تو ظاہر بات ہے کہ پوری زندگی مطالعے میں گذر جائے گی، پوری زندگی خطابت میں گذر جائے گی؛ لیکن اپنی اصلاح کبھی نہ ہوگی؛ لیکن اگر آدمی مطالعے میں اپنے آپ کو مخاطب بنائے کہ میں اپنے لیے پڑھ رہا ہوں، اپنی اصلاح کے لیے پڑھ رہا ہوں، اپنے آپ کو بنانے کے لیے میں مطالعہ کر رہا ہوں، تو ان شاء اللہ العزیز یہ مطالعہ خود کی اصلاح کا بھی کچھ فائدہ دے سکتا ہے۔ پھر مزید اس مطالعے کا یہ فائدہ ہوگا کہ ان ہی باتوں کو خطبے میں بھی بیان کر سکتا ہے؛ لیکن مطالعے کا مقصد اپنی زندگی کو بدلنا ہو، نہ کہ صرف بیان کرنا۔

مجاہدے کے بغیر اصلاح نہیں ہوتی

پانچویں بات جس کے بغیر اصلاح نہیں ہوتی، وہ یہ کہ سالک اس راستے پر چلنے کے لیے محنت و مجاہدہ کرے، قربانیاں دینے کی عادت ڈالے، اپنے جذبات کی قربانی، اپنی خواہشات کی قربانی دے، نیند کی قربانی دے، نیکیوں پر چلنے کے لیے مشقت ہو، تو برداشت کرے، گناہوں کو چھوڑنے پر تکلیف محسوس ہو، تو ہمت سے کام لے؛ مگر افسوس کہ آج کل لوگ اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے ذرہ برابر مشقت برداشت کرنا نہیں چاہتے، مال حاصل کرنے، دنیا حاصل کرنے، عہدہ حاصل کرنے، ہر چیز کے لیے محنت کرنے تیار ہیں، مگر دین کے لیے، اللہ کو پانے کے لیے، اللہ کی

معرفت حاصل کرنے کے لیے، آخرت کو بنانے کے لیے محنت ومجاہدہ کرنے بالکل تیار نہیں ہیں؛ حالاں کہ اس کے بغیر یہ دل دل ہی نہیں بنتا۔

کیا خوب کہا ہے حضرت مجذوب رحمہ اللہ نے:

آئینہ بنتا ہے رگڑے لاکھ، جب کھاتا ہے دل
کچھ نہ پوچھو دل بڑی مشکل سے بن پاتا ہے، دل

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے طالب کی غفلت پر اظہارِ تعجب کیا ہے، اسی طرح جہنم سے بچنے کا ارادہ کرنے والے کی غفلت پر بھی اظہارِ تعجب کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا رأيتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا ، وَ لَا مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا.» (الترمذي:٢٦٠١)

(میں نے دوزخ جیسی خطرناک چیز نہیں دیکھی، جس سے بھاگنے والے سوتے رہتے ہوں اور نہ جنت جیسی چیز دیکھی، جس کے طالب غفلت کی نیند میں ہوں۔)

لہٰذا مجاہدہ کرنا لازم ہے، سونے والے طالب جنت پر حیرت بھی ہے اور افسوس بھی۔

ہم میں پیسوں کے لیے رات رات بھر کام کرنے والے بہت سارے لوگ موجود ہیں؛ مگر آخرت کی دائمی کام یابی کو پانے کے لیے محنت ومشقت کرنے بالکل تیار نہیں، پہلے زمانے میں لوگ اس راہ کو طے کرنے، جو مجاہدہ برداشت کرتے تھے، ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ایک ایک بیماری کو نکالنے سالوں محنت کرتے، اپنے آپ کو ذلیل کرتے، رسوا کرتے، اپنی انا کو خاک میں ملاتے۔

شاہ ابوسعید رحمہ اللہ کا مجاہدہ

حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کے ایک نواسے تھے، ان کا نام تھا حضرت شاہ ابوسعید رحمہ اللہ ، نام تو کچھ اور تھا، کنیت: ابوسعید تھی اور اسی سے مشہور تھے، ان کی مزار بھی گنگوہ میں ہے، بارہا میرا بھی وہاں جانا ہوتا ہے، گنگوہ میں جہاں حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کا مزار ہے، اسی کے عقب میں حضرت شاہ ابوسعید رحمہ اللہ کا مزار ہے۔ یہ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کے نواسے تھے، جوانی کے زمانے میں ان کے اندر کچھ بگاڑ آ گیا تھا، آزاد طبیعت کے ہو گئے تھے، آوارہ گردی آ گئی تھی، ان کے محلے اور اطراف کے لوگ ان کو دیکھ کر افسوس کیا کرتے تھے کہ اتنے بڑے اللہ والے کا یہ نواسہ؛ لیکن حال دیکھو کیا ہے کہ آوارہ گردی میں مبتلا ہیں اور اس میں آگے بڑھتا جا رہے ہیں، ایک بار یہ قصہ ہوا کہ وہ کہیں سے آ رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ ایک بڑھیا چرخے میں دھاگہ بن رہی ہے اور لمبی لمبی تاریں یہاں سے وہاں تک باندھی ہوئی تھی، یہ ابوسعید آئے اور دھاگے کو ایک لات ماری، جس سے کہ وہ دھاگے جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے، وہ بے چاری رونے لگی اور اسی وقت اس کے منھ سے نکل گیا کہ ارے تیرے گھر میں کیسی عظیم دولت تھی اور تیرا کیا حال ہے؟ یہ سن کر ابوسعید سوچنے لگے کہ میرے گھر میں کون سی دولت تھی؟ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے؟ گھر آئے اور اپنی ماں سے پوچھا کہ ہمارے گھر میں وہ کون سی دولت تھی؟ ماں نے بٹھا کر سمجھایا کہ تیرے گھر میں تو ایسی عظیم دولت تھی، کہ ساری دنیا سے آ کر لوگ لے جاتے تھے، یہ تیرے نانا: حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کی معرفت کی دولت تھی، اللہ سے تعلق و محبت کی دولت تھی، یہ دکانِ معرفت تھی، تیرے نانا دکانِ معرفت لگائے بیٹھے تھے اور ساری دنیا

کے تشنگانِ علوم و معرفت یہاں آتے تھے اور یہاں سے سیراب ہو کر جایا کرتے تھے۔ بیٹے کو بٹھا کر ماں نے بہت دیر تک یہ ساری باتیں سمجھائی، تو ان کے دل میں یہ بات آگئی کہ یہ دولت دراصل روحانی دولت ہے، معرفتِ الٰہیہ کی دولت ہے، محبت و عشقِ الٰہی کی دولت ہے، یہ دولت میرے نانا تقسیم کیا کرتے تھے۔

ماں سے پوچھا کہ اگر میں یہ دولت لینا چاہوں؛ تو مجھے کہاں مل سکتی ہے؟ ماں نے حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کے چند خلفا کے نام لیے، ان میں ایک نام حضرت شاہ نظام الدین بلخی رحمہ اللہ کا لیا اور کہا کہ یہ حضرت نظام الدین بلخی تیرے نانا سے بڑے گہرے تعلقات رکھنے والے خلیفہ ہیں، ان کو اس دولت کا بڑا حصہ اللہ نے عطا کیا ہے، اگر تم جانا چاہو؛ تو ان کی خدمت میں جاؤ اور ان سے عرض کرو کہ یہ دولت وہ تم کو عطا کر دیں۔ حضرت شاہ ابوسعید گنگوہی رحمہ اللہ کی سمجھ میں سب بات آگئی، وہ اللہ کے سامنے روئے، گڑگڑائے، اللہ سے معافی مانگی، اپنی گذشتہ زندگی سے توبہ کیا اور ماں سے وعدہ کیا کہ اب تک کی آوارہ گردی سے میں باز آتا ہوں، آئندہ کی اپنی زندگی کو سدھارنے کی کوشش کروں گا اور اس کے لیے حضرت شاہ نظام الدین بلخی رحمہ اللہ کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں، آپ اجازت دیجیے۔

ماں کو بڑی خوشی ہوئی اور اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی تھی؟ کہ ایک آوارہ گرد اُن کا بچہ راہِ راست پر آنے لگا تھا، ماں نے اجازت دی، سفر کی تیاری کی اور اس کے بعد ان کو رخصت کیا، لمبا چوڑا سفر تھا، سفر کرتے کرتے پہنچے اور حضرت نظام الدین بلخی رحمہ اللہ کو اُنھوں نے پہلے ہی خط بھی لکھ دیا تھا کہ یہ بندہ آپ کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہے، تو حضرت نظام الدین بلخی رحمہ اللہ انتظار میں تھے، لوگوں کو

لگا رکھا تھا کہ دیکھتے رہو، اگر ان کی آمد قریب ہو، تو ہمیں اطلاع کر دینا؛ تا کہ ہم ان کا استقبال کریں؛ کیوں کہ یہ میرے شیخ کے نواسے ہیں۔

اب لوگ لگے ہوئے تھے، جب پتہ چلا کہ وہ اُدھر سے آ رہے ہیں، تو شیخ کو اطلاع دی گئی، شیخ نظام الدین بلخی رَحِمَہُ اللہُ اپنے بہت سارے خلفا، مریدین اور متعلقین کو ساتھ لے کر نکلے اور ان کا استقبال کیا، استقبال اس لیے کیا کہ یہ ان کے شیخ کے نواسے تھے اور اپنے شیخ کی عظمت و محبت و عقیدت نے انھیں مجبور کیا کہ ان کے نواسے کی بھی تعظیم و تکریم کریں، چناں چہ استقبال کیا اور ان کو اپنے خاص مہمان خانے میں ٹھہرایا، ان کے لیے بہت اچھے انتظامات کیے، کھانے کا بندوبست، رہائش کا انتظام وغیرہ کیا۔

جب کھانے اور آرام وغیرہ سے فراغت ہوگئی، تو حضرت نظام الدین بلخی رَحِمَہُ اللہُ نے پوچھا کہ اس وقت سفر کا مقصد کیا ہے؟ کیسے آنا ہوا آپ کا؟ اتنی دور کا سفر صعوبت و تکلیف کا آپ نے گوارا کیا ہے؟ حضرت ابوسعید کہنے لگے کہ حضرت! میرا مقصدِ سفر تو صرف یہ ہے کہ میرے نانا نے جو دولتِ معرفت آپ کو عطا کی ہے، اسی دولتِ معرفت کا ایک حصہ آپ مجھے عطا کر دیں، اسی مقصد سے آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔

جب حضرت ابوسعید رَحِمَہُ اللہُ کی زبان سے نظام الدین بلخی رَحِمَہُ اللہُ نے یہ جملے سنے، تو سنتے ہی ان کا انداز بدل گیا، اب تک تو یہ انداز تھا، جو آپ سن رہے تھے کہ ان کے آگے پیچھے جا رہے ہیں، شہر سے باہر نکل کر استقبال کر رہے ہیں، بہترین کھانے کا، پینے کا، آرام کا عمدہ سے عمدہ انتظام کیا؛ لیکن جب ابوسعید رَحِمَہُ اللہُ نے کہا کہ حضرت! میں اس لیے آیا ہوں کہ معرفت کا وہ خزانہ، جو آپ ہمارے نانا کے

پاس سے لائے ہیں، اس میں سے کچھ حصہ مجھے بھی مل جائے؛ اس لیے آپ کی خدمت میں آیا ہوں، یہ سنتے ہی حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ کا مزاج بدل گیا، انداز بدل گیا، انھوں نے کہا کہ اچھا! اس لیے آئے ہو؟ تو پھر آپ ذرا یہاں گدے سے اٹھیے اور یہاں نیچے بیٹھیے، یہ کہہ کر گدے سے اٹھایا اور نیچے بٹھایا اور خود آپ گدے پر تشریف فرما ہوئے اور پھر لمبی چوڑی گفتگو کر کے ان کا نظریہ اور عندیہ مختلف چیزوں کے بارے میں معلوم کیا اور یہ اندازہ کرنے کے لیے، کہ جب یہ آئے ہیں اللہ کی معرفت لینے کے لیے، تو اس بندے کو اللہ کی معرفت دینے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ اس لیے کہ معرفت دینے کے لیے طریقہ چاہیے اور دینا ہے، تو یہ لینے والا لینے کے قابل بھی ہے کہ نہیں ہے، یہ دیکھنا بھی ضروری ہے، لینے کے قابل نہیں ہے، تو دے دیں کیسے؟ اگر دل میں صفائی نہیں ہے، دل میں پاکی نہیں ہے، دل میں طہارت نہیں ہے، دل میں کدورتیں ہیں، دل میں تکبر ہے، دل میں حسد ہے، دل میں کینہ ہے، دل میں خباثت ہے، رذالت ہے؛ تو یہ معرفت کا خزانہ ایسے دل کو کیسے دیا جائے؟ یہ تو بہت بھاری اور عظیم الشان نعمت ہے، معمولی قسم کی نعمت نہیں ہے، پرکھ پرکھ کر دی جاتی ہے۔

الغرض ابوسعید گنگوہی کو شیخ نظام الدین بلخی نے ان کا جائزہ لینے کے بعد فرمایا کہ تمھارے اندر تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے؛ اس لیے کہ تکبر جس آدمی میں ہوگا، اس کی زبان سے بھی پتہ چلے گا، اُٹھنے بیٹھنے کے انداز سے بھی معلوم ہوگا، زبان استعمال کرے گا، تو اپنی بڑائی کے گیت گانا شروع کر دے گا کہ میں ایسا ہوں، میں ویسا ہوں، تو ان کو حضرت نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ کہنے لگے کہ آپ کے اندر تکبر ہے اور جب تک تکبر کی بیماری ختم ہو نہیں جاتی، اس وقت تک اللہ کی معرفت کا ایک قطرہ وذرہ بھی

تمھارے قلب کے اندر جا نہیں سکتا؛ اس لیے سب سے پہلے تمھارے تکبر کا علاج ہونا ضروری ہے، انھوں نے کہا کہ حضور! جیسے آپ کی مرضی، آپ کا خادم ہوں، آپ مجھے جیسے چاہیں استعمال کریں، انھوں نے کہا کہ کل سے تمھیں ایک کام دیتا ہوں، وہ یہ کہ خانقاہ کے جو بیت الخلا ہیں (جن میں مریدین آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں) ان بیت الخلاؤں کی صفائی کا نظام آپ کے ذمے ہے، کام کرنے والی عورت ہے، وہ آئے گی، پاخانہ جمع کر کے رکھو، وہ اٹھا کے ٹوکرے میں ڈال کر لے جائے گی؛ لیکن آپ کا کام کیا ہوگا؟ صفائی کر کے ایک جگہ جمع کر کے رکھنا اور پھر کام والی آئے گی اور اٹھا کے لے جائے گی۔

بھائیو! غور کیجیے کہ اتنا سخت ترین کام کس کے سپرد کیا جا رہا ہے؟ ایک بہت بڑے گھرانے والے کو، اپنے شیخ کے نواسے کو، کہ بیت الخلا صاف کرو۔ چناں چہ وہ روزانہ بیت الخلا کو صاف کرنے میں لگ گئے، اس طرح بیت الخلا کی خدمت کرتے کرتے ایک سال گذر گیا، ایک سال بعد شیخ نے بھنگن سے کہا، جو روزانہ وہاں سے ٹوکرے بھر بھر کے نجاست لے جاتی تھی کہ دیکھ جب تو بیت الخلا کی گندگی اٹھا کر ٹوکرے میں لے جائے، تو یہاں جو ابو سعید نامی آدمی ہے، اس کے قریب سے گذر جانا، اگر وہ کچھ برا بھلا کہے، تو مجھے سنانا، ان سے مت الجھنا۔

چناں چہ بھنگن نے ایسا ہی کیا، کہ نجاست کا ٹوکرا لے کر چلی اور حضرت شاہ ابو سعید گنگوہی رحمہ اللہ ایک جگہ کھڑے تھے، ان کے پاس سے گذری، جس سے کہ بدبو ان کو بھی محسوس ہوئی، تو ابو سعید کو بڑا غصہ آیا اور غصے ہی میں کہنے لگے کہ "گنگوہ ہوتا؛ تو تجھے دیکھ لیتا" یعنی اپنے گاؤں میں ہوتا، تو بتاتا، اب تو پردیس میں ہوں، کیا کر سکتا ہوں مجبور ہوں؛ اس لیے کچھ نہیں کہتا۔ خیر وہ بھنگن چلی گئی اور کسی وقت آ کر

شیخ کو بتایا کہ انھوں نے ایسا ایسا کہا ہے۔ شیخ نے سن کر کہا کہ ”افوہ! تکبر تو اب بھی باقی ہے!!“؛ اسی لیے یہ جملے ان کے منہ سے نکلے ہیں، پھر ابوسعید کو بلا کر کہا کہ تمھارا تکبر اَبھی نہیں ٹوٹا ہے؛ لہٰذا ایک سال مزید یہی کام کرو۔

اب ایک سال مزید یہی خدمت: بیت الخلا کی صفائی کی ان کو دے دی، پھر ایک سال کے ختم پر بھنگن کو بلا کر کہا کہ گذشتہ سال ہی کی طرح اب بھی ایک ٹوکرا بھر نجاست لے کر جانا اور ابوسعید کے پاس سے گذر جانا، اگر کچھ کہیں، تو ان سے بحث مت کرنا، مجھے آ کر سنانا، بھنگن نے پھر ایسا ہی کیا، تو اس سال ابوسعید نے بھنگن سے کچھ کہا تو نہیں؛ مگر اس بھنگن کو گھور گھور کر دیکھا، تیز نظروں سے دیکھا۔ بھنگن نے آ کر شیخ کو بتا دیا کہ میں نے آپ کے حکم پر ایسا کیا، تو ابوسعید نے کہا تو کچھ نہیں؛ لیکن مجھے گھور گھور کر دیکھا۔ حضرت شیخ نے کہا کہ ابھی بھی تھوڑی سی کسر باقی ہے، یہ فخر و غرور پوری طرح نہیں نکلا ہے؛ لہٰذا پھر ابوسعید کو بلا کر کہا کہ ایک سال مزید یہی کام کرو۔

جب تیسرا سال ہوا، تو یہی قصہ ہوا کہ بھنگن سے شیخ نے کہا کہ ٹوکرا اُٹھا کے لے جانا اور دیکھنا کیا کہتے ہیں؟ اب کی بار، وہ بھنگن غلاظت کا ٹوکرا اُٹھا کر لے جا رہی تھی، ابوسعید کے پاس سے گذر رہی تھی؛ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ وہ گندگی کا ٹوکرا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور وہ ساری غلاظت ابوسعید کے اوپر ہی گر گئی۔ اب تو یہ بڑا کٹھن موقع تھا، بڑا سخت امتحان تھا ابوسعید کا؛ لیکن اب حضرت شاہ ابوسعید تین سال تک مجاہدہ کرتے کرتے اور یہ ڈیوٹی کرتے کرتے، کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے، ان کی بہت اصلاح ہو چکی تھی، اب ان کا حال یہ تھا کہ وہ بڑی عاجزی کے ساتھ بھنگن سے کہنے لگے کہ ”افوہ! میرے یہاں بیٹھنے کی وجہ سے شاید تجھے تکلیف ہو گئی اور میری ہی وجہ سے شاید یہ ہاتھ سے چھوٹ کر یہ ٹوکرا گر گیا؛ اس لیے معاف

کرنا، معاف کرنا، میری وجہ سے تکلیف ہوگئی۔'' یہ کہہ کر وہ گندگی اب اُٹھا اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے ٹوکرے میں ڈالنے لگے۔

دیکھ رہے ہو!! تین سال کے مجاہدے کے بعد تکبر ٹوٹا اور ان کے اندر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی۔

جب شیخ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ ''الحمد للہ! بیماری زائل ہوگئی''، یعنی تکبر کی جو بیماری تھی، وہ ختم ہوگئی ہے۔

(دیکھو: تذکرۃ الرشید: ۲/ ۲۵۵-۲۵۶)

بھائیو! اس طرح اُس زمانے میں اصلاح ہوا کرتی تھی اور اس طرح سے اصلاح لی جاتی تھی اور اصلاح کے لیے ایسی محنت مشقت برداشت کی جاتی تھی۔

اب تو لوگوں نے مجاہدہ ہی چھوڑ دیا ہے اور ایک تو بہت زیادہ ضعف و کم زوری آگئی ہے، پہلے زمانے میں ڈاکٹر و اطبا، جو دوائیاں دیتے تھے، ظاہر بات ہے کہ وہ دوائی آج نہیں کھائی جاسکتی ہے، آج وہ کھائیں گے، تو جلاب شروع ہو جائیں گے، مزاج بدل گئے، طور وطریق بدل گئے، ہوا بدل گئی، سب بدل گیا؛ اس لیے پرانے زمانے کی دوا کام نہیں آتی۔ اسی طرح اصلاح کے یہ نسخے بھی اِس زمانے میں ذرا مشکل ہیں، اگر کسی کو آج تکبر نکالنے والا یہ شیخ بلخی رحمہ اللہ کا نسخہ دے دیں، تو وہ مرید قیامت تک شیخ کا چہرہ ہی نہیں دیکھے گا، وہ ایسا جائے گا، ایسا جائے گا کہ پھر کبھی دوبارہ نہیں آئے گا۔

الغرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کا کام اس طرح ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ شیوخ اپنے زمانے کے حساب سے، اپنے اعتبار سے، مزاج کو دیکھ کر جو مناسب ہوتا ہے، وہ علاج تجویز کرتے ہیں؛ لیکن اس واقعے سے مجھے یہ بتانا ہے کہ

جب تک آدمی اپنے آپ کو اس طرح اصلاح کی لائن میں نہیں لگاتا؛ اس وقت تک اصلاح نہیں ہوتی۔

معرفت کی دولت لینے قابل ہونا ضروری-ایک واقعہ

بھائیو! اب غور کرو کہ یہ ساری مشقت شیخ بلخی رَحِمَہُ اللہُ نے کس لیے کرائی؟ کیوں کہ معرفتِ خداوندی ہر کس وناکس کو نہیں دی جاتی، اس دولت کو لینے بھی لینے کے قابل ہونا ضروری ہے۔

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا: وہ یہ کہ ایک بزرگ تھے، ان کے پاس "اسمِ اعظم" کا وظیفہ تھا، "اسمِ اعظم": اللہ کے اس نام کو کہتے ہیں کہ اس نام کو لے کر جب آدمی دعا کرتا ہے؛ تو جو بھی دعا کرتا ہے، اللہ اس دعا کو قبول کر لیتے ہیں۔ حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔

(أبو داود:١٤٩٥، الترمذي:٣٤٧٥، النسائي:٣٥٤٤)

تو ان بزرگ کو "اسمِ اعظم" معلوم تھا، ایک آدمی کو شوق ہوا کہ مجھے بھی "اسمِ اعظم" سیکھنا چاہیے، تو وہ ان کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حضرت آپ کو "اسمِ اعظم" کا علم ہے، مجھے بھی سکھا دیجیے، اس نے سمجھا کہ کوئی کھیل تماشے کی چیز ہے، جیسے کھیل کھیل میں لوگ کہتے ہیں کہ بھائی! ہمیں بھی دے دو، ہمیں بھی دے دو۔

تو بزرگ نے کہا اچھا! "اسمِ اعظم" کا وظیفہ سیکھنا چاہتے ہو؟ دیکھو پہلے ایک کام کر کے آؤ، جب وہ کام کر کے آؤ گے، تو اس کے بعد میں وہ وظیفہ بتاؤں گا۔ کہنے لگا حضرت! کیا کام ہے؟ کہا کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں ہے، اس گاؤں میں فلاں آدمی رہتا ہے، اس آدمی تک میری چھوٹی سی چیز پہنچانا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت! آپ کی خدمت کے لیے کیا انکار ہے؟ میں حاضر خدمت ہوں،

آپ دیجیے میں ضرور جاؤں گا، یہ میری بڑی سعادت ہوگی کہ میں آپ کی خدمت کروں۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ چھوٹا سا کٹورا ہے، اس میں ایک چیز ہے، یہ ان صاحب تک پہنچانا ہے۔ اس نے کہا کہ بہت اچھا، یہ کہہ کر جب نکلنے لگا، تو ان بزرگ نے کہا کہ دیکھو، یاد رکھنا کہ اس کٹورے کو کھولنا نہیں، جیسے بند ہے ویسے ہی ان تک پہنچانا ہے، اتنی سی خدمت ہے۔ اس نے کہا کہ بہت اچھا اور یہاں سے نکلا، چلتے چلتے راستے میں سوچنے لگا کہ کیا ہوگا اس کے اندر؟ حضرت نے جو دیا ہے، تو اس کے اندر کچھ تو ہوگا؟ ذرا دیکھ تو لوں کہ کیا ہے، مجھے اس میں سے کچھ کھانا نہیں ہے، پینا نہیں ہے، بس صرف دیکھنا ہے کہ اس میں کیا ہے؟

دیکھیے شیطان کیسے پٹی پڑھاتا ہے؟ دل کہہ رہا ہے کہ اس میں حلوہ ہوگا، کھاؤں گا نہیں، برفی بھی ہوگی؛ تو کھاؤں گا نہیں، سونا چاندی ہوگا، تو لے کر بھاگوں گا نہیں، صرف دیکھ لوں گا کہ ہے کیا آخر اس میں؟ صرف دیکھ لینے میں کوئی نقصان تو ہے نہیں، کیا فرق پڑ جائے گا؟ اندر سے شیطان اور نفس ورغلانے لگے، چلتے چلتے نفس کو پہلے تو سمجھانے لگا کہ تو نے وعدہ کیا ہے کہ نہیں کھولنا ہے، نہیں دیکھنا ہے؛ لیکن شیطان برابر وسوسہ ڈالتا رہا، آخر کار اس نے سوچا کہ صرف دیکھنا ہی ہے، دیکھ لیتے ہیں۔ چناں چہ آہستہ سے اس کو کھولا، تو کھولتے ہی یہ ہوا کہ اس میں ایک زندہ چوہا تھا اور وہ کھولتے ہی اس میں سے کود کر بھاگ گیا۔ وہ تو انتظار میں ہی تھا کہ کوئی اس راستے کو کھولے اور میں کود کر بھاگوں، چناں چہ کھلتے ہی بھاگ گیا۔

اب یہ بے چارہ پریشان کہ کیا کرے؟ خیر، بہت پریشان ہونے کے بعد واپس ان ہی کے پاس آیا، جنھوں نے چوہا دیا تھا اور آکر کہنے لگا کہ حضرت! بڑی گستاخی ہوئی مجھ سے، بڑی چوک ہوئی، غلطی ہوئی کہ آپ نے کہا تھا کہ اسے کھولنا نہیں؛ لیکن

مجھے نفس نے ورغلایا، شیطان نے بہلایا پھسلایا، اس طرح آخر کار میں اسے کھول بیٹھا اور جوں ہی کھولا، تو اس میں سے چوہا نکل کر بھاگ گیا، معافی مانگنے کے لیے آیا ہوں۔ ان بزرگ نے کہا کہ معاف ہے، کوئی بات نہیں؛ لیکن یاد رکھو کہ چوہا مقصود نہیں تھا، بل کہ یہ دیکھنا مقصود تھا کہ تمھارے اندر کتنی ''اسمِ اعظم'' کو سنبھالنے کی کتنی قوت وطاقت اور کپاسٹی Capacity ہے؟ تمھارے اندر کتنی قابلیت ہے؟ تمھارے اندر کسی چیز کو سنبھالنے کا کتنا مزاج ہے، تحمل و بردباری کتنی ہے؟ یہ دیکھنا مقصود تھا، چوہا بھیجنا مقصود نہیں تھا، چوہے تو ہزاروں مل جائیں گے؛ لیکن جو چوہے کو سنبھالے یہ کبھی کبھی کوئی ملتا ہے، میں نے تمھیں دیکھ لیا، تمھارے اندر چوہا سنبھالنے کی صلاحیت نہیں، تو تم ''اسمِ اعظم'' کیا سنبھالو گے؟ میں تم کو نہیں سکھا سکتا، یہ کہہ کر واپس بھیج دیا۔ اس طرح پہلے شیوخ پرکھ پرکھ کر معرفت کی دولتیں تقسیم کرتے تھے۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ کا مجاہدہ

ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے کہ حضرت شبلی رحمہ اللہ، جو جنید بغدادی رحمہ اللہ کے خلفا میں شمار ہوتے ہیں، متقدمین میں سے ہیں، وہ ایک زمانے میں ایک علاقے کے گورنر تھے، بہت بڑے علاقے کے گورنر تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے زمانے کے بادشاہ نے سارے گورنروں کو ایک مشورے کے لیے جمع کیا، دورانِ میٹنگ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا: وہ یہ کہ ایک گورنر کو بھری مجلس میں فطری طور پر چھینک آئی، جب آئی، تو اتفاق سے ناک سے رینٹ (ناک کی گندگی) نکل آئی، اس میں کوئی برائی نہیں تھی، یہ سب انسانی تقاضے ہیں، غیر اختیاری طور پر یہ گندگی نکلی؛ لیکن بادشاہ کو اس پر بہت غصہ آیا، اس نے اس گورنر کو بھری مجلس ڈانٹا اور کہا کہ آپ کیسے گورنر ہیں؟ آپ کو ہماری مجلس کے آداب نہیں معلوم؟ کیسی گندی حرکت آپ

نے کی؟! یہ کہہ کر بادشاہ نے ان کو اسی وقت گورنری کے عہدے سے بھی نکال دیا اور مجلس سے بھی اسی وقت اٹھا کر باہر بھیج دیا۔

اس واقعے کا حضرت شبلی رَحِمَہُ اللہ پر بڑا اثر ہوا، یہ سوچنے لگے کہ آخر اس گورنر نے کیا خطا کی؟ یہ چھینک کا آجانا اور گندگی کا نکل جانا، تو غیر اختیاری عمل ہے، ہر انسان کے ساتھ ایسا ہوسکتا ہے، خود بادشاہ بھی انسان ہے اس کے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آسکتا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے حضرت شبلی رَحِمَہُ اللہ کا ذہن اس طرف گیا کہ یہ حاکم تو ہمارے ہی جیسا کھانے پینے والا، پیشاب پاخانہ کرنے والا آدمی ہے، پھر بھی اس نے ایک غیر اختیاری عمل پر اپنی مجلس سے نکال دیا، اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہے، بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس اللہ کے دربار میں ہم روزانہ جان بوجھ کر ہزاروں نافرمانیاں کرتے ہیں، اس کے دربار کی بے ادبیاں کرتے ہیں، اگر اللہ تعالی بھی ہمیں اپنے دربار سے نکال دے تو ہم کہاں جائیں؟

یہ فکر حضرت شبلی رَحِمَہُ اللہ کو تڑپانے لگی اور رات بھر اسی پریشانی میں اُنھیں نیند تک نہیں آئی، آخر کار یہ طے کیا کہ اب باقی زندگی اللہ کے دربار کے آداب سیکھنے میں لگانا ہے، گورنر کے عہدے کو لات مارنا ہے؛ لہٰذا صبح ہوئی، تو فوراً استعفیٰ نامہ لکھ کر حاکم کو پیش کر دیا، بادشاہ نے کہا کہ آپ کیوں استعفیٰ دے رہے ہیں اتنے برے عہدے سے؟ انھوں نے ساری بات کہی اور معذرت کر کے چلے آئے۔

پھر اللہ والوں کی تلاش میں نکلے؛ تاکہ اللہ کی معرفت حاصل کریں اور اللہ کے دربار کے آداب سیکھیں اور حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللہ کی خدمت میں اصلاح کرانے کے لیے پہنچے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا﴾ (الفرقان: ۵۹)

اگر اللہ کے بارے میں پوچھنا ہو، اللہ کی معرفت کے بارے میں، اللہ کی محبت کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کی عبودیت کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کے آداب شاہی کے بہ جا لانے کے بارے میں اگر پوچھنا ہو؛ تو کسی باخبر سے پوچھو، بے خبر سے نہ پوچھو۔

یہ اللہ کے باخبر بندے کون ہیں؟ یہ باخبر وہ ہوتے ہیں، جو دنیا سے بے خبر ہوتے ہیں، ان سے پوچھو اللہ کے بارے میں کہ آدابِ شاہی کیا ہیں؟ آدابِ عبودیت کیا ہیں؟ طریقِ عبودیت کیا ہے؟ اللہ کے شایانِ شان کس طرح جینا ہے؟ وہ اللہ کے بندے بتائیں گے۔

حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے دیکھا کہ یہ شبلی گورنری کے عہدے پر رہ کر آئے ہیں، تو دماغ آسمان پر ہوگا، تکبر بڑی مقدار میں ہوگا؛ اس لیے تکبر نکالنے علاج بھی سخت کرنا ہوگا؛ اس لیے کہ بیماری جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کا علاج بھی اتنا ہی سخت ہوگا۔

چناں چہ حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللّٰہُ نےشبلی سے فرمایا کہ سب سے پہلے آپ کے اندر سے تکبر نکالنے کی ضرورت ہے اور اس کا علاج آپ کے لیے یہ تجویز کیا ہے کہ آپ روزانہ گھر گھر جا کر بھیک مانگیں اور جو بھی رقم ملے اسے غریبوں میں صدقہ کر دیں، ایک سال تک یہی علاج ہے۔

حضرت شبلی نے اس کو قبول کیا اور ایک سال تک بھیک مانگتے رہے، در در اور گھر گھر جا کر لوگوں سے بھیک مانگتے اور جو ملتا، اسے غربا میں تقسیم کر دیتے۔

دیکھیے! کتنا سخت علاج کیا تکبر نکالنے اور حضرت شبلی نے بلا چوں و چرا اس کو قبول کیا اور اس پر عمل کیا، کوئی معمولی بات نہیں ہے گورنری چھوڑ کر بھیک مانگنا، دل

پر آرے چلیں گے؛ لیکن جو اللہ کے لیے جینا چاہتا ہے، وہ دل پر کیا، جسم پر بھی آرا چلانے تیار ہوتا ہے، اس مشقت ومجاہدے کے بعد وہ گورنر شبلی ''حضرت شبلی'' بنے۔ آج ہم حضرت شبلی رحمہ اللہ کا نام احترام سے لیتے ہیں؛ اس لیے کہ جو اپنے آپ کو مٹاتا ہے، اللہ اس کے مقام کو بلند کر دیتے ہیں، اس طرح مجاہدوں کے بعد اللہ کی معرفت ملتی ہے۔

ہمت کے بغیر مجاہدہ ممکن نہیں

اب ایک آخری بات سن لیجیے، جو تمام مذکورہ امور کی کنجی ہے اور اس کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا اور وہ ہمت ہے۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ دین و دنیا کا کوئی بھی کام ہو، اس کے لیے ہمت کی ضرورت ہے، ہمت ہی انسان کو ہر میدان میں آگے بڑھاتی ہے اور کامیابی کی منزل طے کراتی ہے؛ لہٰذا سالکین کے لیے بہت ہی ضروری ہے کہ وہ اللہ کے راستے کو طے کرنے کے لیے ہمت سے کام لیں اور آگے بڑھیں۔

مگر اس معاملے میں اکثر سالکین کا حال یہ ہے کہ وہ خواہش تو بہت رکھتے ہیں، کہ اللہ کا راستہ طے کریں؛ لیکن ہمت نہیں کرتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجاہدہ نہیں کر پاتے، معمولی معمولی امور میں بھی مجاہدہ ان کے لیے مشکل بن جاتا ہے، حتی کہ نماز فجر کا اہتمام نہیں ہوتا، ''تا بہ تہجد چہ رسد؟!'' بعض لوگ سالہا سال لگے رہنے کے باوجود اسی لیے ناکام رہ جاتے ہیں کہ ہمت سے کام نہیں لیتے۔

بھائیو! یاد رکھیں کہ ہمت سے کام لینا لازمی ہے؛ لہٰذا اگر نماز فجر کو اٹھنا ہے، تو ہمت کرنا ہوگا، اگر نامحرم سے آنکھ بند کرنا ہے، تو ہمت سے کام لینا ہوگا، اگر تہجد پڑھنا ہے تو، اگر غیبت سے بچنا ہے تو، اگر فحش و بے حیائی سے پرہیز کرنا ہے تو، اگر کوئی اور

کام دکا کرنا ہو یا برائی سے بچنا ہو تو، ہمت سے کام لیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں برائی سے بچنے کا ارادہ کرتا ہوں؛ مگر میں بچ نہیں سکتا، بار بار میرا ارادہ ٹوٹ جاتا ہے، اس کا جواب یہی ہے کہ یہ لوگ ہمت نہیں کرتے، اگر ہمت سے کام لیں؛ تو کیوں نہیں بچ سکتے؟

ہمت کیا ہے؟ ہمت یہ ہے کہ پکا ارادہ کرلیں کہ فلاں غلط کام نہیں کروں گا، اس کے بعد نفس جتنا چاہے، تقاضا کرے، اس کام کو ہرگز ہرگز نہ کرے، خواہ دم نکل جائے یا اور کچھ ہو جائے۔ بتائیے کہ اگر کوئی ایسی ہمت کرلے؛ تو کیا وہ کام یاب نہیں ہو جائے گا؟ ضرور بالضرور کام یاب ہو جائے گا۔

مگر لوگ اس کے لیے تیار نہیں کہ ہمت سے کام لیں اور کچھ کریں؛ بل کہ ایسا لگتا ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خود بہ خود قدرتی طور سے یا کراماتی انداز سے وہ گناہ سے بچ جائیں یا نیکیاں کرنے لگیں، ان کو کچھ کرنا نہ پڑے، جب کوئی لڑکی سامنے آئے، تو ان سالک صاحب کو تو کچھ کرنا نہ پڑے؛ البتہ یہ چاہتے ہیں کہ خود بہ خود اُن کی آنکھ بند ہو جائے، گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں تو بند نہیں کروں گا، خود وہی بند ہو جائے۔

بھائیو اور دوستو! اولاً تو ایسا ہوتا نہیں؛ کیوں کہ یہ اللہ کی سنت کے خلاف ہے اور اگر ہو بھی جائے؛ تو اس سے آپ کو کچھ بھی فائدہ نہیں؛ کیوں کہ خود بہ خود آنکھ بند ہو گئی، تو اس میں آپ کا کیا کمال ہے اور اس میں آپ کو کیا ثواب ہے؟

الغرض اللہ کو چاہنے والے کو چاہیے کہ وہ قربانی دے اور ہمت کر کے کام کرے اور اللہ کا راستہ طے کرے، اس کے بغیر راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ راستہ کوئی دشوار نہیں ہے؛ بل کہ ہمت نہ ہونے سے دشوار لگ رہا ہے۔

حضرت خواجہ مجذوب صاحب رحمۃ اللہ نے اپنے اشعار میں کہا ہے:

تجھ کو جو چلنا طریقِ عشق میں دشوار ہے
تو ہی ہمت ہار ہے تو ہی ہمت ہار ہے
ہر قدم پر تو جو ''رہرو'' کھا رہا ہے ٹھوکریں
لنگ خود تجھ میں ہے؛ ورنہ راستہ ہموار ہے

لہٰذا لنگ اور عذر کو چھوڑو اور راہِ خدا میں ہمت کر کے آگے بڑھو، پھر دیکھو کہ راستہ کس طرح آسانی سے طے ہوتا ہے؟

مشکل معلوم ہو، تو نہ گھبرائیں اور مجذوب صاحب رحمۃ اللہ کا یہ قطعہ پڑھ لیا کریں، جس سے راستہ آسان معلوم ہوگا، وہ کہتے ہیں:

کتنی ہی مشکلات ہوں، پروا نہ چاہئے
اقدام راہِ حق میں دلیرانہ چاہیے
لیکن یہ گُر رسائی منزل کا یاد رکھ
کوشش تو خوب چاہئے، دعویٰ نہ چاہئے

یہاں ایک بات یہ بھی کہتا چلوں کہ ہمت کیوں نہیں ہوتی ہے اور اس میں کونسی چیز رکاوٹ بنتی ہے؟ وہ یہ ہے کہ انسان پہلے سے یہ نہ جانے کہ مجھے محنت ومجاہدہ کس کام کے لیے کرنا ہے؟ اگر اسے یہ معلوم ہو اور سمجھ میں آجائے کہ مجھے محنت ومجاہدہ اس لیے کرنا ہے کہ مجھے اللہ کو پانا ہے، تو وہ بڑی سے بڑی مشکل کو بھی آسان سمجھے گا؛ کیوں کہ اللہ کو پانے کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے، وہ کم ہے۔

مجذوب صاحب رحمۃ اللہ کہتے ہیں، ان ہی کا قطعہ ہے، اس کو بھی پڑھتے رہیے، وہ کہتے ہیں:

فکرِ حصولِ مرضیٔ جاناں نہ چاہیے
اس دھن میں جو بھی حال ہو، پروا نہ چاہیے
ہر ہر قدم پر راہِ طلب میں ہیں مشکلیں
ہر ہر قدم پہ ہمتِ مردانہ چاہیے

آیئے! ہم بھی اپنی اصلاح کریں

آیئے! ہم بھی اپنا علاج کروائیں اور اپنی زندگیوں کی اصلاح کروائیں، آخرت کی فکر پیدا کریں اور ایسا نہ ہو کہ سرسری سا کچھ کرلیا اور چلے گئے، بیماری اپنی جگہ پر رہی اور ہم اپنی جگہ پر رہے، اس سے کیا فرق آئے گا؟ زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی؟ اپنے آپ کو ہم نے کیا بنایا؟ روزانہ اس کا جائزہ لیجیے، میں کل کہاں تھا اور آج کہاں تک پہنچا ہوں؟ ایک مہینے پہلے کہاں تھا؟ ایک مہینہ گذرنے کے بعد کہاں کھڑا ہوں؟ میری فکر میں کیا تبدیلی آئی؟ میرے اعمال میں کیا تبدیلی آئی؟ میری زبان میں کیا تبدیلی آئی؟ میری آنکھوں میں کیا تبدیلی آئی؟ میرے دل میں کیا تبدیلی آئی؟ میرے دماغ میں کیا تبدیلی آئی؟ میرے اخلاق میں کیا تبدیلی آئی؟ ان سب چیزوں کا محاسبہ کرتے رہنے سے آدمی کو پتہ بھی چلتا رہتا ہے کہ کیا کمایا، کیا گنوایا؟ ایک مہینہ گذر گیا دکان کھول کر، آخر میں حساب کرتا ہے کہ نہیں کرتا؟ ایک مہینے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ میں نے کیا کمایا، کیا گنوایا؟ کیا گنوایا ہے، تو سوچے گا افوہ! ایک مہینے میں اتنا نقصان ہو گیا؟ اب آئندہ مہینے میں تو مجھے ایسا نہیں کرنا ہے، آئندہ مہینے میں مجھے اپنی اس غلطی کی اصلاح کرنی ہے، اپنے دماغ کا صحیح صحیح استعمال کرنا ہے، کاروبار کو ٹھیک طور پر انجام دینا ہے، کہیں غلطی ہو رہی ہے، اس غلطی کی اصلاح مجھے کرنی ہے۔

اور اگر جائزہ لیے بغیر ہی چلتا رہا چلتا رہا، ایک سال گذر گیا، ایک سال کے بعد جو دیکھا، تو معلوم ہوا کہ جو سرمایہ لگایا تھا، وہی غائب ہوگیا، پورے کا پورا ختم ہوگیا اور کوئی سرمایہ بچا نہیں، تو اب کفِ افسوس ملتا رہے گا۔

تو میرے بھائیو اور دوستو! اس نوبت کے آنے سے پہلے پہلے اپنا جائزہ لو اور یاد رکھو کہ ہمارے پاس بھی ایک سرمایہ ہے، جو اللہ نے ہمیں دیا اور ہم اس سرمائے کو لگائے ہوئے ہیں، وہ سرمایہ کیا ہے؟ وہ سرمایہ ہمارے اوقات ہیں، ہماری زندگی کے اوقات یہ ہمارا سرمایہ ہے، ایک مہینہ گذرنے کے بعد ہم اپنے سرمائے کا جائزہ لیں کہ ہم نے ایک مہینے میں اتنے اوقات لگائے، اتنے دن لگائے، اتنے گھنٹے لگائے، اتنے دن اور گھنٹے لگانے کے بعد ہمیں ایک مہینہ میں کیا ملا؟ کیا ترقی ہوئی؟ میں کہاں سے کہاں پہنچا ایک مہینے میں؟ ایک مہینہ پہلے میں کہاں تھا؟ ایک مہینہ بعد میں کہاں ہوں؟ اگر دل کہہ رہا ہے کہ جہاں تھا، وہیں ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مہینے کی آپ کی یہ محنت بے کار گئی اور اگر آپ جائزہ لیتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے سے کم زور ہوگیا ہوں، پہلے تو نماز کی پابندی کیا کرتا تھا، اب اس میں بھی کوتاہی ہے، پہلے تو تھوڑا بہت ذکر کیا کرتا تھا، اب وہ بھی مجھ سے نہیں ہو رہا ہے، پہلے تو ذرا آنکھوں کی حفاظت کیا کرتا تھا، اب تو آنکھیں بھی آزاد ہوگئی ہیں، پہلے ذرا زبان پر قابو ہوتا تھا؛ لیکن اب تو بے تحاشہ بولنے لگا ہوں، اب ایک مہینے کے بعد یہ شکل ہوگئی ہے، تو آپ کو پھر یہ یقین کر لینا چاہیے کہ آپ کا سرمایہ ختم ہوگیا اور آپ دینی و روحانی ارعتبار سے پٹ لٹ گئے ہیں۔

اور اگر یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ پہلے تھوڑی کمی تھی، اب میں زیادہ اہتمام سے نماز پڑھ رہا ہوں، ذکر میں بھی آگے بڑھ رہا ہوں، کینہ کپٹ بھی نکال رہا

ہوں، تکبر بھی کم ہو رہا ہے، تواضع اندر داخل ہو رہی ہے، اللہ کی محبت بھی اندر داخل ہو رہی ہے، معرفتِ خداوندی میں سے بھی کوئی حصہ مجھے مل رہا ہے، خوفِ خداوندی بھی دل میں چلا آ رہا ہے، پہلے رونا ہی نہیں آتا تھا، دل میں اتنی سختی تھی، اب مجھے اللہ کے سامنے رونا بھی آ رہا ہے، اللہ کے سامنے گڑگڑانے کو بھی دل چاہ رہا ہے، نمازوں میں بھی دل لگ رہا ہے، خشوع وخضوع پیدا ہو گیا ہے، سجدے لمبے کرنے کو دل چاہ رہا ہے، لمبے رکوع کے لیے طبیعت آمادہ ہو رہی ہے، اگر یہ کیفیت وحالت ہے؛ تو یہ سمجھیے کہ آپ کا سرمایہ آپ کو نفع دے رہا ہے اور آپ گھاٹے میں نہیں؛ بل کہ نفع میں ہیں۔

حضرات! یہ ہے جائزے کا مطلب۔ ان ساری باتوں کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم جو لگ رہے ہیں اور وقت لگا رہے ہیں، اس وقت کے لگانے سے ہمیں فائدہ ہو، نقصان کی طرف ہم نہ جائیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا نسخہ اور مجذوب صاحب کے اشعار

اخیر میں شیخ سے استفادے کے سلسلے میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا بیان فرمودہ نسخہ بھی سنتے چلیے، جس کو حضرت کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مجذوب صاحب رحمہ اللہ نے نظم کر دیا ہے۔ مجذوب صاحب کہتے ہیں:

چار شرطیں لازمی ہیں استفاضے کے لیے
اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد
یہ مقفی قول ہے، رنگین بھی سنگین بھی
حضرت مرشد کا یہ ارشاد ، رکھ تا عمر یاد

لہٰذا شیخ سے عقیدت ومحبت رکھتے ہوئے اطلاعِ احوال کا اہتمام کرے اور شیخ جو علاج تجویز کرے، اس پر ہمت کے ساتھ عمل کرے، یہی راستہ ہے شیخ سے

استفاضے واستفادے کا، جس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔

اب دعا کریں کہ اللہ ہمیں صحیح معنوں میں صحیح چیزوں کو سوچنے اور غور وفکر کے ساتھ صحیح معنوں میں ان پر عمل کی توفیق مرحمت فرمائیں اور اس راستے سے اللہ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

قلوب میں سختی کیوں آتی ہے؟

کس کام کا وہ دل ہے، جس دل میں تو نہ ہو
بس نام کا وہ گل ہے، جس گل میں بو نہ ہو
حجروں میں لاکھ بیٹھیے، خلوت مگر کہاں
جب تک جان و دل میں بسا تو ہی تو نہ ہو

(خواجہ مجذوب رحمہ اللہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قلوب میں سختی کیوں آتی ہے؟

الحمد لله و كفىٰ وسلام علىٰ عباده الذين الصطفىٰ ، أما بعد:

فقد قَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم :

﴿ أَلاَ إِنَّ فِيْ الْجَسَدِ لَمُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ ، صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ ، وَ إِذَا فَسَدَتْ ، فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ ، الاَ ؛ وَ هِيَ الْقَلْبُ. ﴾

(البخاري:۱/۱۳،مسلم:۲/۸۲)

(حضرت نبی کریم- صلی اللہ علیہ وسلم - نے فرمایا: گوشِ ہوش سے سن لو! بلا شبہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے؛ تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے؛ تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے اور سن لو کہ وہ دل ہے۔)

دل کی دو قسمیں

انسان کے دل دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک دل وہ ہوتے ہیں، جن کے اندر نرمی ہوتی ہے اور اسی نرمی کے نتیجے میں انسان کے دل کے اندر اچھائیوں کو بویا جا سکتا

ہے، اچھی چیزیں اس میں داخل کی جاسکتی ہیں اور پھر جب اچھی چیز بوئی جاسکتی ہے، داخل کی جاسکتی ہیں، تو اس میں سے اچھی چیزیں اُگ بھی سکتی ہیں اور باہر نکل بھی سکتی ہیں اور دوسروں کو فائدہ بھی پہنچاسکتی ہیں۔

دوسرے وہ قلوب ہیں، جن کے اندر سختی ہوتی ہے، جیسے کے پتھر میں سختی ہوتی ہے۔ ایسے دلوں کے اندر نہ کوئی اچھائی گھس سکتی ہے، نہ ان میں کوئی اچھی چیز بوئی جاسکتی ہے، نہ اگائی جاسکتی ہے، نہ کوئی اچھی چیز ان سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہ ہیں دو قسم کے دل انسانوں کے، جو دل نرمی والے ہوتے ہیں؛ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہوتے ہیں، محبوب ہوتے ہیں، وہ اللہ کے مقرب ہوتے ہیں اور جو قلوب سختی والے ہوتے ہیں؛ وہ اللہ کے نزدیک مردود ہوتے ہیں، ملعون ہوتے ہیں، مقہور ہوتے ہیں۔ آپ قرآن وحدیث کے نصوص میں غور وفکر کریں گے، تو ان دونوں قسم کے قلوب کا آپ کو اندازہ ہوگا۔

دیکھیے، اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتے ہیں:

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ (البقرۃ: ۷۴)

(اس کے بعد پھر تمھارے دل سخت ہوگئے، پس وہ ایسے ہیں، جیسے کہ پتھر یا پتھر سے بھی زیادہ سخت۔)

حقائق کو بتانے کے بعد، معجزات اور قدرت کے عظیم مظاہر کو پیش کرنے کے بعد، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمھارے دل پھر سخت ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دلوں میں سے بعض میں سختی ہوتی ہے اور وہ پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے اندر کوئی اچھائی داخل نہیں ہوسکتی، جیسے پتھر کے اندر کوئی چیز

داخل نہیں ہوسکتی۔

ایک حدیث سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے، چناں چہ ایک حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے جو مجھے ہدایت اور علم دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے خوب بارش، جو زمین پر پڑے۔ پس اس میں سے ایک زمین نقی و پاکیزہ تھی، جس نے پانی کو قبول کیا اور اس سے گھاس وغیرہ اُگ آئی اور ایک زمین بنجر تھی، جس نے پانی کو روک رکھا، پس اللہ نے اس سے لوگوں کو نفع پہنچایا، کہ اس سے انھوں نے خود پانی پیا اور دوسروں کو پلایا اور کھیتی کی اور ایک ایسی زمین پر بھی یہ پانی پڑا، جو محض چٹیل تھی، جو نہ تو پانی کو روک کر جمع کر سکتی تھی اور نہ کوئی چیز اگا سکتی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مثال ہے، اس کی جو دین کی سمجھ پیدا کرتا ہے اور علم حاصل کرتا اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس کی مثال ہے، جو اس علم کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور اس ہدایت کو جس کو دے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے، قبول نہیں کرتا۔"

(البخاري:۷۹،مسلم:۶۰۹۳)

ایک حدیث کی تشریح

اس حدیث میں تین قسم کی زمینوں کو بیان کر کے تین قسم کے دلوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی ایک زمین زرخیز ہوتی ہے، جب اس پر پانی پڑتا ہے، تو فوراً اندر جذب ہو جاتا ہے، جذب ہونے کے بعد اس کے اندر بڑی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، زرخیزی پیدا ہو جاتی ہے، اس کے اندر اُگانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک

زمانہ آتا ہے کہ اس سے مختلف قسم کی چیزیں اُگیں گی اور مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچتا رہے گا۔

اسی طرح جو دل نرم ہوتے ہیں، ان پر جب علم وہدایت کی بارش ہوتی ہے، تو وہ علم وہدایت اور نیکیوں، خوبیوں کو جذب کر لیتے ہیں اور پھر اس علم وہدایت سے وہاں علم کے چشمے پھوٹتے ہیں اور ہدایت کا نور جاری ہوتا ہے اور ان سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے۔

دوسری زمین وہ، جس میں اُگانے کی صلاحیت تو نہیں، لیکن وہ بارش کے پانی کو روک رکھتی ہے، جیسے تالاب و چشمے، گڑھے وغیرہ اور لوگ یہاں سے پانی لے جاتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح ایک دل وہ ہوتے ہیں، جو علم وہدایت اور خوبیوں کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؛ بل کہ صرف اوپر اوپر سے سن لیتے ہیں اور ان کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر برے نہیں؛ کیوں کہ ان سے اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ سنی ہوئی باتیں کبھی دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں اور اس سے لوگ فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

اور تیسری قسم کی زمین، وہ سخت قسم کی زمین ہے، جس میں اُگانے کی صلاحیت ہے، نہ پانی کو روک لینے کی صلاحیت ہے؛ بل کہ جو پانی اس پر پڑتا ہے، وہ سب کا سب بہہ بہہ کر چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دل وہ ہیں، جو سخت ہونے کی وجہ سے پتھر جیسے ہیں اور ان میں نہ تو پانی قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ کچھ اُگانے کی۔ دل ایسے ہیں کہ اللہ کی جانب سے جو پیغامِ ہدایت اور علمِ شریعت آتا ہے، اسے قبول کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اس کو دیکھنا اور اس کی جانب نظر کرنا بھی گوارا نہیں کرتے اور اس سے اعراض و روگردانی کرتے ہیں۔

اب سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے دل کیسے ہیں؟ ہمارے دلوں کا حال کیا ہے؟ آج عام طور پر دلوں کا حال یہ ہے کہ دلوں کے اندر سختی پیدا ہوگئی ہے، اتنی سختی کہ قرآن سنتے ہیں اثر نہیں ہوتا، حدیث سے اثر نہیں ہوتا، اللہ کی بات آتی ہے اثر نہیں ہوتا، قرآن کا حکم آتا ہے، اثر نہیں ہوتا، اللہ کے نبی کا فرمان آتا ہے اثر نہیں ہوتا، اثر تو کیا ہوتا؟! اس قدر وہ ان کے نزدیک بے اثر ہوتے ہیں کہ اس کو سن کر اپنے دل و دماغ سے نکالنے کی فکر کرتے ہیں، اسے پھینکنے کی فکر کرتے ہیں، سننا تک گوارہ نہیں ہوتا۔

قساوتِ قلب، کبیرہ گناہ ہے

قساوتِ قلب اسی لیے اس قدر بری و بدتر چیز ہے کہ اس کی وجہ سے انسان خدا ہی سے دور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ دل کی سختی گناہِ کبیرہ میں سے ہے اور اس پر ایک حدیث سے دلیل دی ہے، وہ یہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اطْلُبُوا الْمَعْرُوفَ مِنْ رُحَمَاءِ أُمَّتِي ، تَعَيَّشُوا فِي أَكْنَافِهِمْ ، وَلاَ تَطْلُبُوهُ مِنَ الْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ؛ فَإِنَّ اللَّعْنَةَ تَنْزِلُ عَلَيْهِمْ . » (الزواجر عن اقتراف الكبائر:۱/۲۰۲)

(نیکی، بھلائی تو میری امت کے رحم دل لوگوں سے حاصل کرو؛ اس طرح کہ ان کی چوکھٹ پر جا کر پڑ جاؤ اور رہو! اس نیکی کو سخت دل لوگوں سے طلب نہ کرو؛ ان پر تو خود لعنت برستی ہے۔)

اور علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ ہی نے امام خرائطی رحمہ اللہ کے حوالے سے ایک اور حدیث نقل کی ہے، جس میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

« فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُوْنَ سَخَطِيْ . » (الزواجر عن اقتراف الكبائر:۱/۲۰۲)

(یہ سخت دل لوگ میرے غضب کا انتظار کر رہے ہیں۔)

قساوتِ قلبی کو گناہِ کبیرہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ گناہوں کا نتیجہ ہے، کہ جب آدمی گناہ پر گناہ کرتا ہے؛ تو اس کی وجہ سے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز کسی غلط کام اور گناہ کی وجہ سے پیدا ہو، وہ بھی گناہ ہی شمار ہوتی ہے؛ اسی لیے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ اس کو گناہِ کبیرہ قرار دے رہے ہیں۔

قساوت، شقاوت کی دلیل

ایک اور حدیث سے قساوت کی برائی کا اندازہ کیجیے کہ اس میں قساوت کو شقاوت یعنی بدبختی کی علامت کہا گیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَرْبَعَةٌ مِنَ الشَّقَاءِ : جُمُوْدُ الْعَيْنِ ، وَ قَسَاءُ الْقَلْبِ ، وَ طُوْلُ الْأَمَلِ ، وَ الْحِرْصُ عَلَى الدُّنْيَا. »

(مسند البزار:۶۴۴۲، حلية الأولياء:۶/۱۷۵)

(چار چیزیں شقاوت یعنی بدبختی میں سے ہیں: ایک آنکھوں کا جمود یعنی نہ بہنا، دوسرے دل کی سختی، تیسرے لمبی آرزو اور چوتھے دنیا کی حرص۔)

اور یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں سخت دل والے کو اللہ سے سب سے زیادہ دور قرار دیا گیا ہے۔

امام ترمذی وغیرہ حضراتِ محدثین نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَ إِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِيُ.»

(لوگوں میں سے سب سے زیادہ اللہ سے دور؛ وہ قلب ہے، جو سخت ہو۔)

(الترمذي: ۲۴۱۱، الدعاء للطبراني: ۲/۵۶ ، الأحكام الشرعية : ۳/۲۸۴، جامع الأصول: ۱۱/ ۷۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ سخت دلی کس قدر بری و ناپاک چیز ہے کہ سخت دل انسان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے دور ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت دلی سے پناہ مانگی ہے

یہاں تک کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قساوتِ قلبی سے پناہ مانگی ہے، احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ اپنی دعا میں یہ بھی کہتے تھے:

«اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ.» (النسائي: ۵۴۵۸، الترمذي: ۳۴۸۲)

(اے اللہ! میں ایسے دل سے پناہ مانگتا ہوں، جس میں خشوع نہ ہو۔)

غور کیجیے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قساوت وسختی والے دل سے پناہ مانگ رہے ہیں، تو یہ چیز کس قدر بری ہوگی؟!

دلوں میں سختی کے اسباب

جب یہ معلوم ہوگیا کہ دل کی سختی انتہائی بری چیز ہے، جس سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں سختی کیوں آتی ہے؟

علما نے لکھا ہے کہ اس کی کئی وجوہات ہیں؛ لیکن ان سب میں بنیادی وجوہات، جن کی طرف توجہ دینے سے دیگر وجوہات خود ہی ختم ہو جاتی ہیں، وہ تین بڑی باتیں

ہیں؛ جن کی وجہ سے قلوب میں سختی پیدا ہوتی ہے اور دل پتھر بن جاتے ہیں۔

(۱) دنیا کی محبت (۲) آخرت سے غفلت (۳) گناہوں کی کثرت

یہ تین اسباب ہیں، جن میں پھنستے پھنستے انسان قسی القلب (سخت دل) ہو جاتا ہے۔

پہلا سبب: دنیا کی محبت

اب آیئے! ہم ان اسباب پر ذرا غور کریں؛ تاکہ بات پوری طرح اور اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

میں نے عرض کیا کہ دل کی سختی کا پہلا سبب: دنیا کی محبت ہے، جب انسان دنیا کی عورتوں کی محبت میں، دنیا کے مال کی محبت میں، دنیا کی اشیا کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے، تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے؛ اس لیے کہ دنیا سخت چیز ہے اور دنیا کی یہ سختی انسان کے دل میں آجاتی ہے، ہم جانتے ہیں کہ انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے، تعلق پیدا کرتا ہے، اس چیز کے اثرات اور آثار دلوں پر اور نفوس پر مرتب ہوتے ہیں؛ لہٰذا دنیا ہے قسی، تو اس سے تعلق پیدا کرنے والوں پر اس کی سختی کا اثر ہوتا ہے اور ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔

اور دنیا کی قساوت کا تو کیا کہنا؟ دیکھیے! کبھی یہ دنیا اپنے بنانے والے کے پاس نہیں رہتی، ایک آدمی بڑی محنت کرتا ہے، جماتا ہے، کماتا ہے، بڑا مجاہدہ کرتا ہے، بلڈنگیں بناتا ہے، سب کچھ تیار ہونے کے بعد جب اس کے دنیا سے جانے کا نمبر آتا ہے، جب وہ جانے لگتا ہے، تو دنیا کہتی ہے: میں تو کسی اور کی ہوں، تیرے ساتھ آنے کی نہیں۔

دیکھیے! کتنی قساوت ہے دنیا کے اندر؟! اگر کچھ بھی نرم دلی ہوتی؛ تو کم از کم کمانے والے کے ساتھ تو ضرور چلی جاتی؛ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے، کہ جو اُسے لینے کے لیے اس کے پیچھے جاتا ہے، وہ اس کے ہاتھ لگنے میں بہت دیر لگاتی ہے، جلدی نہیں ملتی، بڑے مجاہدات کے بعد، بہت ستانے کے بعد، بہت پریشان کرنے کے بعد آدمی کو ملتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا مزاج سختی کا ہے، اس کے اندر نرمی نہیں ہے۔

مولانا قاسم نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی ایک بات

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک موقع پر فرمایا تھا، جب کہ ان کو بھوپال کے ایک رئیس نے کچھ مال لا کر بہ طور تحفہ دیا، حضرت نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، اللہ کے واسطے تم اسے واپس لے جاؤ، تو اس رئیس نے حضرت کی جوتیوں میں وہ مال ڈال دیا، حضرت جوتے پہننے کے لیے آئے؛ تو دیکھا کہ جوتیوں میں پیسے بھرے ہیں، حضرت نے اپنے انگوٹھے سے جوتے کو الٹا کیا اور اس مال کو نیچے ڈال دیا اور اس کے بعد ایک جملہ فرمایا:

> ”یہ دنیا بھی عجیب ہے، جو اس کے پیچھے بھاگتا ہے، یہ اس سے بھاگتی ہے اور ہم اس سے بھاگتے ہیں؛ تو یہ ہمارے پیچھے آتی ہے۔“

تو دنیا والے جب اس کے پیچھے بھاگتے ہیں، تو یہ ان کو ملتی نہیں، ان سے بھاگتی رہتی ہے۔ یہ دنیا کی سختی کی علامت ہے، جب یہ اپنے مزاج میں سختی رکھتی ہے، تو جو آدمی اس سے محبت کرے گا؛ اس کا دل بھی سخت ہو جائے گا؛ اس لیے کہ صحبت کی تاثیر تو معروف چیز ہے۔

سود خور کے دل کی سختی

الغرض دنیا کی سختی دنیا سے محبت کرنے والے کے دل میں آجاتی ہے، اس کی

ایک مشاہداتی دلیل یہ ہے کہ سودخور کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ دنیا سے بڑی محبت کرتا ہے اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں اس سے زیادہ قسی القلب بھی کوئی نہیں، سودخور دنیا سے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے اور اسی محبت سے، اسی پیار سے پیسے بناتا ہے، لوگوں کو سود پر پیسہ دیتا ہے اور پیسہ سے پیسہ وصول کرتا ہے، اس کو کسی پر رحم نہیں آتا، وہ فقیر سے فقیر انسان سے بھی اپنا سود وصول کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔ اسی کو سود کہتے ہیں، شریعت اس کو حرام کہتی ہے۔

جب اس طرح وہ پیسے کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے، تو اس کا دل اتنا سخت ہو جاتا ہے، کہ جب ایک مجبور آدمی، پریشان آدمی، بھوکا پیاسا آدمی، بچے اس کے بھوک اور پیاس سے تڑپ رہے ہیں، بلبلا رہے ہیں، ایسا کوئی آدمی اس سے آ کر کہتا ہے کہ بھائی میں پریشان ہوں، میرے اوپر مصیبتیں آ گئی ہیں اور میں کئی دن سے کھانا نہیں کھایا ہوں، میرے بچے کئی دن سے فاقے میں مبتلا ہیں، میری بیوی کا یہ حال ہے، میرے بچوں کا یہ حال ہے، کچھ اللہ کے لیے رحم کرو اور مجھے قرض کی ضرورت ہے؛ اس لیے تم مجھے دو تین ہزار روپے قرض دے دو۔

سودخور کے دل کی سختی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ یہ سودخور اس فقیر ومحتاج سے کہتا ہے کہ ہاں! رقم دوں گا، لے جاؤ؛ مگر تم کو اس کا اتنا سود بھی دینا ہوگا اور اگر اس مدت میں ادا نہ کیا؛ تو ڈبل سود دینا پڑے گا۔ کیا اس سے بڑھ کر قساوت قلب کی کوئی مثال چاہیے؟ سودخور کو کسی کی ضرورت وتنگی اور مجبوری کا کوئی خیال نہیں آتا، اسے تو بس اپنا روپیہ بڑھانے کی فکر ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ فقیر اور محتاجوں کی مجبوری وتنگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

اب وہ آدمی اس سے قرض لے گیا، لے جانے کے بعد پتہ نہیں کہ کیا حالات

پیش آئے؛ لیکن بہ ہر حال اسے اتنے روپے دینا ہے اور اس کے ساتھ مزید دینا ہے، وہ بالکل معاف نہیں اور پھر اگر اس نے ایک مہینے کی مدت پوری کرنے کے بعد اس کو ادا نہیں کیا، تو وہ کہتا ہے کہ اس میں مزید اتنے ملا کر دینا ہے اور پھر ایک مہینے کی تاخیر ہوگئی، تو اور اضافہ کر کے دینا ہے۔

اس کو حرام قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (آل عمران: ۱۳۰)

(اے ایمان والو! تم سود در سود نہ کھایا کرو!)

اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہمیشہ قسی القلب ہوتا ہے اور اس کے اندر کا دل بہت سخت، پتھر کی سل کی طرح ہو جاتا ہے۔ وہ محتاجوں اور غریبوں، مسکینوں اور یتیموں سے کوئی ہم دردی و غم خواری کا جذبہ نہیں رکھتا؛ بل کہ ان کی یتیمی و مسکینی و فقیری و محتاجی کا استحصال کرتا اور اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت کا شکار و گرفتار قسی القلب وسخت دل وسخت مزاج ہوتا ہے؛ کیوں کہ دنیا کی سختی کا اس پر اثر ہو جاتا ہے۔

دوسرا سبب: آخرت سے غفلت

دل کی سختی کا دوسرا سبب: آخرت سے غفلت ہے اور یہ سبب پہلے سبب کا نتیجہ اور اس کا مسبب ہے؛ کیوں کہ آخرت سے غفلت دراصل دنیا سے محبت کا نتیجہ ہوتا ہے؛ لہٰذا دنیا کی محبت، آخرت سے غفلت کا سبب ہے اور آخرت سے غفلت دنیا کی محبت کا مسبب ہے، جب پہلی بات پائی جائیگی، تو دوسری بات خود بہ خود ہی آجائے گی؛ اس لیے کہ جو دنیا کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے، وہ یقیناً آخرت سے غافل ہوتا ہے؛ اس لیے کہ یہ دو چیزیں یعنی دنیا اور آخرت ان کے بارے میں حضرت وہب

بن منبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« مَثَلُ الدُّنیَا وَ الآخِرَةِ کَمَثَلِ رَجُلٍ لَهُ ضَرَّتَانِ، إِن أَرْضٰی إِحدَاهُمَا أَسخَطَ الأُخرٰی. »

(الزھد لابن المبارک:۵۹۴)

(دنیا وآخرت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کی دو سوکنیں یعنی دو بیویاں ہوں کہ ایک کو راضی کرتا ہے تو دوسری ناراض ہو جاتی ہے۔)

یہ مضمون ایک حدیث میں بھی آیا ہے، چناں چہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ أَحَبَّ دُنیَاهُ أَضَرَّ بِآخِرَتِهِ ، وَ مَنْ أَحَبَّ آخِرَتَهُ أَضَرَّ بِدُنیَاهُ ، فَآثِرُوا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا یَفْنٰی. »

(مسند أحمد:۴/۴۱۲،المستدرک:۴/۳۴۳، شعب الإیمان:۷/ ۲۸۸)

(جس نے اپنی دنیا سے جی لگا لیا، اس نے اپنی آخرت کا نقصان کیا اور جس نے اپنی آخرت سے جی لگا لیا، اس نے اپنی دنیا کا نقصان کیا، لہٰذا تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔)

الغرض دنیا وآخرت ایک دوسرے کی ضد ہیں؛ لہٰذا آخرت کا تذکرہ اور آخرت کی یاد انسان کے لیے انتہائی لازمی اور ضروری ہے؛ اسی لیے قرآن میں اور حدیث میں اس کا تفصیلی اور بار بار ذکر کیا گیا ہے؛ تاکہ آخرت سے کوئی آدمی غافل نہ ہو اور دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔

کیوں کہ آخرت سے غفلت کی وجہ سے بھی انسان کا دل سخت ہو جاتا ہے اور اگر آخرت کو یاد کرے گا؛ تو اسے کبھی قبر یاد آئے اور کبھی موت یاد آ جائے ،موت کی سختیاں اس کو یاد آئیں، موت کے حالات اس کو یاد آئیں، آخرت کے حالات اس

کو یاد آئیں، قبر میں ہونے والے سوال وجواب کا قصہ اُسے یاد آئے، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کی بات اس کو یاد آئے، ترازو میں اعمال کے تولنے کا مسئلہ اس کو یاد آئے۔

یہ ساری باتیں یاد آئیں گی؛ تو دل کے اندر سختی کہاں باقی رہے گی؟ اس لیے جو لوگ ان چیزوں کو بالکل یاد نہیں کرتے، کبھی بھول کر بھی آخرت کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، ان کے دل انتہائی سخت ہو جاتے ہیں اور سختی تو ان کو یہاں تک پہنچاتی ہے کہ آپ قرآنی آیات ان کے سامنے پڑھیں؛ مگر ان پر ان کا کوئی اثر نہیں، حدیث پڑھیں، اثر نہیں؛ بزرگوں کی باتیں بتائیں، تو کوئی اثر نہیں ہوگا۔

یہ کیوں؟ اس لیے کہ دل سخت ہو چکا ہے اور آخرت سے غفلت نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا کہ دلوں میں کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔

تیسرا سبب: گناہوں کی کثرت

دل کی سختی کا تیسرا سبب گناہوں کی کثرت ہے، کیوں کہ گناہوں کی کثرت کا نتیجہ بھی دل کی سختی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور گناہوں کی کثرت، آخرت سے غفلت کا نتیجہ ہوتا ہے، جب دنیا کی محبت آئی؛ تو اس سے پیدا ہوئی آخرت سے غفلت اور جب آخرت سے غفلت آئی، تو اس سے پیدا ہوئی گناہوں کی کثرت؛ اس لیے کہ جسے آخرت ہی یاد نہیں ہے، وہ گناہوں سے کیوں بچے گا؟ اب گناہ کرتا جا رہا ہے، لوگوں پر ظلم بھی کر رہا ہے، مال بھی گھسوٹ رہا ہے، لوگوں کی املاک کو قبضے میں لا رہا ہے اور کسی آدمی پر ظلم کر رہا ہے، کسی کو قتل کر رہا ہے، کسی کو مار رہا ہے، کسی کو جلا کر خاک بنا رہا ہے، کسی کو گالی دیتا ہے، کسی کے دل کو ٹھیس پہنچاتا ہے، کسی کی غیبتیں کرتا ہے، اس طرح ہزاروں قسم کے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے؛ اس لیے کہ

اس کے دل کی سختی اتنی زیادہ ہے کہ نرمی اس کے اندر آتی ہی نہیں، اس طرح یہ ساری چیزیں اس کے دل کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔

گناہ دل کو زنگ آلود بنا دیتے ہیں

دل کی اس سختی و برائی کا ذکر، جو گناہوں کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، ایک حدیث میں آیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے، تو اس کے دل کے اوپر ایک دھبہ لگتا ہے، اگر وہ توبہ کرتا ہے سچے پکے دل کے ساتھ، تو وہ صاف ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر اس نے توبہ نہیں کی اور گناہ پر گناہ کرتا رہا؛ تو اس کے وہ داغ، دھبے بڑھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آتا ہے، کہ پورا دل کالا ہو جاتا ہے۔ یہ فرما کر آپ نے کہا کہ قرآن میں اللہ نے اسی کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (ہرگز نہیں، ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔)''

(الترمذي:٣٣٩٠)

دیکھیے! اس حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف بتایا ہے کہ دل پر گناہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ زنگ کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے، اگر فوراً توبہ کر لیا؛ تو وہ زنگ دور ہو جاتا ہے؛ ورنہ وہ بڑھتے بڑھتے سارے دل کو کالا اور زنگ آلود کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں دل سخت ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ - صلی اللہ علیہ وسلم - : إنَّ هٰذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الحَدِيْدُ إذَا أصَابَهُ المَاءُ ، قِيْلَ : يَا

رَسُولَ اللّٰہ! وَمَا جِلائُھَا؟ قَالَ : كَثْرَةُ ذِكْرِ المَوتِ وَتِلاوَةُ القُرْآنِ.» (شعب الإیمان:١٨٥٩)

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دل اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں، جس طرح پانی لگنے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ حضراتِ صحابہ کی جانب سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! اس کی صفائی کا کیا طریقہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کثرت سے موت کی یاد اور قرآن کریم کی تلاوت!)

اور پھر یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی آدمی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو ایک گناہ سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا شروع ہو جاتا ہے، گویا کہ ایک سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے، اس طرح جب یکے بعد دیگرے گناہ کرتے کرتے دلوں میں سختی پیدا ہو جاتی ہے، تو جناب! سوچ لیجیے کہ اب اس کے دل کا کیا حال ہوگا؟ ایک تو دنیا کی محبت نے اس کے اندر پیدا کی سختی، دوسرے آخرت سے غفلت نے پیدا کی سختی، تیسرے گناہوں کی کثرت نے پیدا کی سختی؛ یہ تینوں جمع ہو کر اس کے دل کا کیا حال بناتے ہوں گے؟!!

اس لیے جو آدمی چاہتا ہے کہ میرے دل کے اندر نرمی پیدا ہو، تو اسے ان تینوں چیزوں سے سب سے پہلے پرہیز کرنا چاہیے۔ دنیا کی محبت کو اپنے دل سے نکالنا چاہیے، آخرت کی فکر پیدا کرنا چاہیے، گناہوں کو چھوڑنا چاہیے؛ اس لیے کہ اگر یہ چیزیں جاری رہیں، تو دل میں سختی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

اس لیے ان تینوں چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنا چاہیے، جب ان تینوں سے بچ جائے گا، تو دل کو نرم کرنے کے لیے ایک آیت بھی اس کے سامنے پڑھنا کافی ہو جائے گا۔

دلوں کو نرمانے کے نسخے

آئینہ بنتا ہے رگڑے لاکھ جب کھاتا ہے دل
کچھ نہ پوچھو دل بڑی مشکل سے بن پاتا ہے دل

(خواجہ مجذوب رحمہ اللہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله و كفىٰ وسلام علىٰ عباده الذين الصطفىٰ ، أما بعد:
فقد قَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم :

﴿ أَلاَ إِنَّ فِيْ الْجَسَدِ لَمُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ. ﴾

(البخاري:١/١٣،مسلم:٢/٨٢)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گوشِ ہوش سے سن لو! بلا شبہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے؛ تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے؛ تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے اور سن لو وہ دل ہے۔)

دل کو نرمانے کے پانچ نسخے

محترم حضرات! گزشتہ مجلس میں یہ بات تفصیل سے آئی تھی کہ مختلف اسباب کی وجہ سے ہمارے دلوں میں سختی پیدا ہوتی ہے، جس انسان کے دل کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے؛ لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے؛ کیوں کہ گناہوں اور دنیوی محبتوں کی وجہ سے دلوں میں جو سختی پیدا ہوتی ہے، یہ کوئی لا علاج بیماری نہیں ہے؛ بل کہ اس کو دور کرنے

اور قلوب کو نرم کرنے کے نسخے بھی موجود ہیں، جن کو استعمال کرنے سے دل کو نرم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

یہاں پانچ نسخے آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں؛ تاکہ ہم ان کے ذریعے اپنے دلوں کو نرم کریں اور قلوب کو منور کریں۔

ان میں سے قرآنِ پاک کی تلاوت ایک نسخہ ہے، ذکر اللہ ایک نسخہ ہے، موت کی یاد اور قبروں کی زیارت ایک نسخہ ہے، اہلِ بکا کی صحبت ایک نسخہ ہے۔

اہلِ علم کے لیے رقائق کی ضرورت

ان نسخوں کا استعمال کرنا، جس طرح عام لوگوں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اہلِ علم حضرات اور بالخصوص فقہ پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے بھی بہت ضروری ہے؛ کیوں کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ فقہ پڑھتے پڑھتے آدمی کا دل سخت ہو جاتا ہے، یہ بات آپ کو بڑی تعجب خیز لگے گی؛ لیکن ہے حقیقت اور یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں؛ بل کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''إحیاء علوم الدین'' کے اندر بالکل ابتدا ہی میں لکھی ہے: وہ لکھتے ہیں:

"التَّجَرُّدُ لَهُ عَلَى الدَّوَام يُقْسِي الْقَلْبَ ، وَ يَنْزِعُ الخَشْيَةَ منه كما نُشاهِدُ الآنَ من المُتَجَرِّدِين له."

(إحياء العلوم:١/٢٢)

(فقہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یکسو ہو کر رہ جانا، دل کو سخت کر دیتا ہے اور اس سے اللہ کا خوف وخشیت نکال دیتا ہے، جیسا کہ اب ہم ان لوگوں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اس کے لیے خاص ہو کر رہ جاتے ہیں۔)

وجہ اس کی یہ ہے کہ فقہ پڑھتے ہوئے ردوقدح بہت ہوتی ہے، جرح ہوتی ہے، ایک دوسرے پر تنقید ہوتی ہے اور تحقیق کے لیے بڑے بڑے لوگوں پر تبصرے کیے جاتے ہیں اور یہ کرتے کرتے دلوں کے اندر سختی آجاتی ہے؛ اس لیے بہت ضرورت ہوتی ہے، ان لوگوں کو جو فقہیات کا درس دیتے اور لیتے ہیں کہ وہ بار بار ''کتاب الرقائق'' کا بھی مطالعہ کیا کریں۔ ''الرقائق'' وہ ابواب ہیں، جن کے اندر دل کو نرم کرنے کے متعلق احادیث اور آثار اور اقوال بیان کیے جاتے ہیں، جب آدمی فقہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھتا رہے گا؛ تو ان شاء اللہ دل نرم بھی ہوتا جائے گا۔ بہ ہر حال دل کو نرم کرنے اور اس کی سختی کو دور کرنے کی سبھی کو ضرورت ہے اور اہلِ فقہ کو خصوصیت کے ساتھ ضرورت ہے۔

دل کو نرمانے کا پہلا نسخہ- تلاوت قرآن

اب سنیے کہ دل کو نرم کرنے کے لیے جو نسخے ہیں، ان میں سے پہلا نسخہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام کیا جائے اور بالخصوص جب کہ وہ سمجھ کر ہو، تو اس کا اثر اور زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں بیان کیے گئے وعدوں اور وعیدوں کو سمجھ کر پڑھے، ان پر غور کرے، اللہ کے احکام کو پیار سے پڑھے، ان میں غور کرے، اس میں بیان کی گئی اللہ کی صفات و کمالات کو سمجھنے کی کوشش کرے، آیات میں مذکور آخرت کے احوال، حساب و کتاب کے مراحل، جنت اور جہنم کے احوال کو بہ غور مطالعہ کرے، اس طرح قرآن کی تلاوت ایک عجیب اثر پیدا کرتی ہے اور اس سے دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔

قرآنِ پاک میں ایک جگہ اس کا ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ

تَقْشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ.﴾ (الزمر:۲۳)

(اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام (یعنی قرآن) نازل کیا ہے: ایک ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جس کے مضامین بار بار دہرائے گئے ہیں، جس سے ان لوگوں کے بدن کانپ اٹھتے ہیں، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں؛ پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور جس کو اللہ گم راہ کردے؛ اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔)

دیکھا! آپ نے کہ اس آیت میں، قرآن کی تلاوت کا کیسا اثر بتایا گیا ہے؟! کہ اس سے دل و بدن نرم ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ اللہ کے ذکر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آیت میں پوری رات گزار دی

تلاوت کا یہی اثر تھا کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک پڑھتے تھے، تو آپ پر اس کا عجیب کیف اور عجیب حال طاری ہو جاتا تھا، بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ پوری پوری رات ایک آیت تلاوت کرتے ہوئے گذار دیتے تھے، رات میں شروع کرتے اور صبح تک ایک ہی آیت پڑھتے رہتے اور اس پر غور و خوض کرتے اور اسی کے ساتھ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم روتے بھی رہتے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے اندر کھڑے ہوئے اور آیت تلاوت کرنے لگے:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ .﴾ (المائدۃ :۱۱۸)

(اے اللہ! اگر آپ بندوں کو عذاب دینا چاہیں؛ تو وہ آپ ہی کے بندے ہیں اور اگر آپ معاف کر دیں؛ تو آپ ہی طاقت ور اور حکمت والے ہیں۔)

یہ آیت دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلنے والا ایک جملہ ہے، جو قرآنِ مجید کے اندر نقل ہوا ہے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی لوگ، جو اللہ کو چھوڑ کر خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنائے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں قیامت میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اپنے امتیوں کو خدا کو چھوڑ کر خود کی عبادت کا سبق دیا تھا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ اے اللہ! میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں اور اگر بالفرض کیا بھی ہوتا، تو آپ کو تو اس کا ضرور علم ہوتا۔ پھر وہ کہیں گے کہ اے اللہ! اگر آپ ان لوگوں کو عذاب دینا چاہیں، تو یہ تو آپ کے بندے ہیں، آپ ان کو عذاب دے سکتے ہیں، آپ کو کون روکنے والا ہے؟ اور اگر آپ مغفرت کرنا چاہیں، بخش دینا چاہیں، تو اس کا بھی آپ کو پورا پورا اختیار ہے؛ اس لیے کہ آپ تو بڑے زبردست طاقت والے، قدرت والے ہیں، آپ کو کون روکنے والا ہے؟

یہ آیتِ کریمہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے جا رہے تھے اور روتے جا رہے تھے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پوری رات اسی آیت کی تلاوت

پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بسر کر دی۔

(السنن الکبری للنسائي:۱/۳۵۳،المستدرک للحاکم:۱/۳۲۷،سنن البیهقي:۳/۱۳)

اس سے اندازہ کیجیے کہ قرآنِ پاک اللہ کا کیسا کلام ہے؟! دل کو کیسا گداز کرتا ہے، نرم کرتا ہے اور اس کے اندر کیسی نرمی اور لطافت پیدا کر دیتا ہے؟!!

تو بہ ہر حال اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بہت سی روایتیں مروی ہیں کہ آپ قرآن پڑھ رہے ہیں، روتے چلے جا رہے ہیں، دل کی نرمی کا عجیب وغریب حال لوگوں کے سامنے آتا جا رہا ہے۔

قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رلایا

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابن مسعود! تم قرآن پڑھ کر مجھ کو سناؤ، میں تم سے قرآن سننا چاہتا ہوں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قرآن تو آپ پر نازل ہوا ہے، میں آپ کے سامنے کیسے پڑھ سکتا ہوں؟ جس پر خود قرآن نازل ہوا، اس کو میں پڑھ کر سناؤں؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تم پڑھو اور میں سنوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن پاک کی سورت ﴿سُوْرَةُ النِّسَآءِ﴾ پڑھنی شروع کر دی اور پڑھتا جا رہا تھا، پڑھتا جا رہا تھا، بہت دیر پڑھنے کے بعد میں نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کو دیکھا کہ آپ کا کیا حکم ہے، مزید پڑھنے کا یا رک جانے کا؟ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، تو آپ زار وقطار رو رہے تھے۔

(صحیح البخاري:۴۵۸۲،الترمذي:۳۰۲۵،السنن الکبری للنسائي:۸/۱۳۸)

اب بتایئے کہ یہ اللہ کے کلام کی برکت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ اللہ کے کلام کی تاثیر نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ دلوں میں ایسا اثر کرتا تھا کہ جب پڑھنے والا پڑھتا تھا، تو پڑھنے والے پر بھی اور جو سنتے تھے ان پر بھی، دونوں پر اس کا اثر مرتب ہوتا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے کافر لوگ، جن کے دلوں کی سختی خدا کی قسم! پتھروں سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی؛ لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن ان کے سامنے پڑھتے تھے، تو ان کے دل بھی ایسے نرم ہو جاتے تھے جیسے کہ موم ہو۔

حدیث کا ایک واقعہ یاد آیا کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ پاک کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ، اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ (الحج: ۱-۲)

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈر کر زندگی گذارو؛ کیوں کہ قیامت کا زلزلہ بڑا خطرناک وحشت ناک ہوگا، اس دن تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور کوئی عورت اگر حاملہ ہوگی؛ تو اس کا وضعِ حمل ہو جائے گا اور لوگوں کو تم نشے کی حالت میں دیکھو گے؛ حالاں کہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے؛ لیکن اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔)

جب یہ آیتیں نازل ہوئیں، تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، سفر کے موقع پر یہ آیتیں، اس وقت نازل ہوئیں، جب کہ حضراتِ صحابہ ایک جگہ پر پڑاؤ

ڈالے ہوئے تھے اور آرام کرنے کے لیے سایہ دار درختوں کے سائے میں جا کر منتشر ہو گئے تھے، کوئی اس درخت کے پیچھے، کوئی اس درخت کی آڑ میں، تمام صحابہ متفرق اور منتشر ہیں کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے سب کو جمع فرمایا، سارے صحابہ جمع ہو گئے۔

آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: لوگو! اس وقت میرے اوپر اَبھی چند آیتیں نازل ہوئیں ہیں، میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں، پھر اس کے بعد یہ آیتیں پڑھ کے سنانے لگے۔

(السنن الكبرى للنسائي:٢/١٠٧، المستدرک للحاکم:٣/٤٧، مسند أحمد: ١٩٩٠١، المعجم الكبير للطبراني:٥٤٦)

اس سے قیامت کے زلزلے کی خطرناکی اور وحشت ناکی کا اندازہ کرو، اس میں ایک تو کہا گیا ہے کہ ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی، جب کہ ماں اپنے بچے کو کبھی بھولتی نہیں، وہ اپنے کو بھلا دیتی ہے، اپنی نیند کو قربان کر دیتی ہے؛ لیکن کبھی بچے کو بھولتی نہیں ہے، کتنی اور کیسی بھی تکلیف اس کو ہو جائے، اسے کسی بھی طرح کی پریشانی آجائے، وہ اپنی تکلیفوں کو بھول جاتی ہے؛ لیکن اپنے بچے کو کبھی نہیں بھولتی۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ وہاں یہ صورتِ حال ہوگی کہ اپنے بچے کو ماں بھول جائے گی، وہ بھی کون سا بچہ، جو دودھ پیتا بچہ ہے؟

دوسرے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہاں کی اتنی خطرناک اور وحشت ناک صورتِ حال ہوگی کہ اگر کوئی عورت حاملہ ہوگی، تو اسے وضعِ حمل ہو جائے گا؛ کیوں؟ وہاں کے خوف و دہشت کی وجہ سے یہ ہوگا۔

تیسرے یہ فرمایا گیا کہ وہاں لوگوں کے قدم خوف کی وجہ سے نشہ پیے ہوئے

لوگوں کی طرح لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے ہوں گے؛ حالاں کہ انھوں نے کوئی نشہ نہیں پیا ہے۔

یہ ہے قیامت کا حال اور وہاں کے زلزلے کا منظر! جب اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ آیتیں سنائیں، تو ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، بخاری کی روایت میں ہے:

''فَشَقَّ ذٰلِکَ عَلَی النَّاسِ حَتّٰی تَغَیَّرَتْ وُجُوْھُھُمْ.''

(یہ بات لوگوں پر شاق گزری، یہاں تک کہ ان کے چہرے متغیر ہوگئے۔)

ترمذی کی ایک روایت میں ہے:

''فَأَنْشَأَ الْمُسْلِمُوْنَ یَبْکُوْنَ.''

(مسلمانوں نے رونا شروع کردیا۔)

طبرانی میں ہے کہ جب آپ نے یہ آیات زور سے پڑھیں، تو صحابہ کو یوں معلوم ہوا کہ ''إِنَّ السَّاعَةَ قَدْ قَامَتْ.'' (قیامت قائم ہوگئی۔)

(البخاري:۴۷۴۱، الترمذي:۳۱۶۸، المعجم الكبير للطبراني:۱۴۷۴۳)

یہ کیا ہے؟ دل کی نرمی کی کیفیت ہے! تو معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک کو اس طرح پڑھنے کی ضرورت ہے، کبھی اس کے مضامین پر غور کرنے کی ضرورت ہے؛ لیکن عام طور پر قرآن پڑھنے والے بہت کم اور قرآن پر غور کرنے والے تو اتنے کم کہ ہم تو اس کی کوئی گنتی اور حساب ہی نہیں شمار سکتے، کہ کتنی کم ہے یہ تعداد؟ اس لیے کبھی کبھی قرآنِ پاک کو غور وفکر سے پڑھو، ترجمے کے ساتھ پڑھو اور اس کے معانی اور مطالب کو دیکھو اور ویسے بھی بغیر سمجھے صرف تلاوت کرنے سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ الغرض قرآنِ کریم دلوں کو نرم کرنے کا عظیم نسخہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل کو کس چیز نے نرم کیا؟

آخر سوچنے کی بات ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے سخت دل انسان کو نرم کرنے والی کون سی طاقت تھی؟ کتنا بڑا سخت ترین آدمی! سخت دل انسان! ان کے اندر اتنی سختی تھی کہ وہ اسلام لانے کے بعد بھی باقی رہی؛ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں کہنا پڑا: « أَرْحَمُ أُمَّتِي بِأُمَّتِي أَبُو بَكْرٍ، و أَشَدُّهُم في أَمْرِ اللهِ عُمَر » کہ تمام صحابہ میں میری امت پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے تو ابو بکر ہیں، ان کا دل بڑا نرم ہے، بڑا گداز ہے اور اللہ کے معاملے میں سب سے زیادہ میرے صحابہ میں سخت عمر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں زمانوں کی سختی میں بڑا فرق ہے؛ کیوں کہ اسلام لانے کے بعد آپ کے اندر جو سختی تھی، وہ اللہ کے دین کے لیے سختی تھی اور اسلام لانے سے پہلے جب وہ کفر میں تھے، اسلام میں ابھی داخل نہیں ہوئے تھے، ان کی سختی اسلام کے خلاف، اللہ و رسول کے خلاف تھی، اس وقت سختی کا یہ عالم تھا کہ اللہ کا نام لینے والوں کو مارتے تھے، ان کی ایک باندی مسلمان ہوگئی تھی، اس باندی کو اتنا مارتے، اتنا مارتے، اتنا مارتے کہ مارتے مارتے تھک کر بیٹھ جاتے، یعنی اس خیال سے نہیں کہ یہ مار کھا کے تھک گئی ہوگی؛ بل کہ مارتے مارتے جب خود ہی تھک جاتے، تو کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ حال تھا حضرت عمر کا اور اسی سختی کا مظاہرہ کرنے کی نیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے نکلتے ہیں، یہ ارادہ کر کے نکلتے ہیں کہ آج (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کر کے چھوڑوں گا۔ چناں چہ تلوار سونتے ہوئے راستے میں جا رہے تھے، ایک صحابی حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور ان کو بھی مارنے کے لیے بڑھے، صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے کیا مارتے ہو؟ ذرا اپنی بہن کے گھر کا جائزہ لو، تمھاری بہن بھی تو محمد کی غلام ہو

چکی ہے، یہ سننا تھا، بس وہیں ان کا دماغ پلٹ گیا، ان کو تو چھوڑ دیا اور سیدھے پہنچ گئے اپنی بہن کے گھر، وہاں جب پہنچے، تو دیکھا کہ ان کی بہن اور بہنوئی دونوں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے قرآن سیکھنے اور پڑھنے میں مشغول تھے، حضرت خباب رضی اللہ عنہ ان کو قرآن پڑھا رہے ہیں اور یہ دونوں قرآن سیکھ رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا، تو انھوں نے قرآنی اوراق اٹھا کر ایک طرف کو رکھ دیے، حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو کہیں چھپا دیا، حضرت عمر اندر گھسے اور پوچھا کیا تم مسلمان ہو گئے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں، ایمان میں ہم داخل ہو گئے ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ بہنوئی کو پکڑ کر انھوں نے بہت مارا، بہن درمیان میں چھڑانے آئیں، تو ان کو بھی مار دیا، بہت دیر تک مارتے رہے، سخت دلی کا مظاہرہ کرتے رہے، پھر کچھ دیر بعد کہنے لگے کہ تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے، ذرا مجھ کو بھی دکھاؤ، انھوں نے کہا تم ناپاک ہو، تمھارے ہاتھ میں ہم کیسے یہ دے دیں؟ غسل کرو، وضو کرو تو پھر وہ چیز تمھیں دکھائی جا سکتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کیا، وضو کیا، پھر اس کے بعد ان کے سامنے وہ قرآنی اوراق رکھے گئے، جس کے اندر ﴿سُوْرَةُ طٰهٰ﴾ لکھی ہوئی تھی۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑھنے لگے، وہ تو عربی زبان کے ماہر تھے، اب پڑھ رہے ہیں:

﴿ طٰهٰ ☆ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْکَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰی ☆ اِلَّا تَذْکِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰی ☆ تَنْزِيْلاً مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ☆ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اِسْتَوٰی ☆ ﴾

اب پڑھتے جا رہے ہیں، پڑھتے جا رہے ہیں، جیسے جیسے پڑھتے جا رہے ہیں،

دل نرم ہوتا جا رہا ہے، کہاں گئی سختی؟ اتنے سخت دل انسان کہ سختی کا مظاہرہ کرنے نکلے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آج قتل کر کے چھوڑوں گا اور پھر یہاں آئے، تو بہن اور بہنوئی کو مارنے لگے؛ لیکن اس کے بعد جب قرآن پڑھنے لگے، تو وہی قرآن اب ان کے دل کو نرم کرنے لگا، کچھ دیر پڑھنے کے بعد بہن سے کہنے لگے میں بھی محمد کا غلام ہونا چاہتا ہوں۔ اللہ اکبر!!

یہ زمانہ اسلام کا اولین دور تھا، چند لوگ مسلمان ہوئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ''دارِارقم'' میں محبوس رہتے تھے، بند رہتے تھے، چلنا پھرنا، آنا جانا، لوگوں کے سامنے سے گزرنا؛ یہ ان کے لیے بہت زیادہ مشکل بات تھی؛ لہٰذا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ''دارِارقم'' میں بند تھے۔

ان کے بہن اور بہنوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لے کر ''دارِارقم'' پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا، ایک صحابی نے اندر سے جھانک کر دیکھا، تو دیکھا کہ خطرناک آدمی کھڑا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ تلوار بھی لٹکی ہوئی ہے، انھوں نے دروازہ نہیں کھولا اور جا کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! دروازے پر عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور تلوار بھی لٹکی ہوئی ہے، معلوم نہیں کس ارادے سے آئے ہیں؟

روایات میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی سے ایک رات پہلے اللہ سے دعا کر چکے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابو جہل)؛ ان دونوں میں سے کسی کو مسلمان بنا کر، دین کو تقویت عطا فرما، آپ نے رات کو یہ دعا کی تھی۔

جب یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ عمر کھڑے ہیں، تلوار لٹکی ہے، معلوم نہیں کس ارادے سے آئے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

دروازہ کھول دو، اچھی نیت سے آیا ہے تو ٹھیک، اگر غلط نیت سے آیا ہے تو اسی کی تلوار سے اس کا سرتن سے جدا کر دیا جائے گا۔ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حکم سے دروازہ کھولا گیا، عمر رضی اللہ عنہ اندر پہنچے اور کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوگئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لاتے ہی حضراتِ صحابہ پانچ دس، جو وہاں موجود تھے، انھوں نے اتنے زور سے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا کہ وہاں کا آس پاس کا سارا علاقہ گونج اٹھا۔ (حوالہ)

بہ ہرحال یہ واقعہ میں نے اس لیے آپ کو سنایا کہ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دل کو نرم کرنے میں قرآن کیسا رول ادا کرتا ہے؟ عمر جیسے سخت ترین انسان کے دل کو نرم کرنے والا یہ قرآن ہمارے دلوں کو بھی ضرور بدل دے گا؛ اس لیے کہ ہم مسلمان تو ہیں، ایمان تو رکھتے ہیں، اللہ کو اور اللہ کے رسول کو مانتے ہیں، قرآن پر یقین ہے، تو پھر اللہ کے اس کلام کی وہ تاثیر ہمارے اوپر بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ ہاں! ہمارے اندر کمی یہ ہے کہ ہم اس کے اوپر توجہ نہیں کرتے، غور و فکر سے پڑھتے نہیں ہیں، کیسی کیسی آیتیں ہیں؟!! دل کو دہلا دینے والی، دل کی کایا پلٹ کر دینے والی، اللہ کے عذابات کی آیتیں، جنت کے احوال کی آیتیں، دوزخ کے احوال کی آیتیں، قبر کے احوال کی آیتیں، موت کا تذکرہ، موت کے وقت انسان کے اوپر پیش آنے والے احوال؛ یہ ساری کی ساری باتیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پھیلا رکھی ہیں اور ایسے عجیب عجیب انداز سے، عجیب عجیب طریقوں سے کہ انسان اسے پڑھے تو ضرور بالضرور اس کا اثر محسوس کرے گا۔

قرآن نے طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کے دل کو بدل دیا

قرآن کی تاثیر پر ایک اور واقعہ یاد آ گیا، طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ مکے

آئے اور یہ دور، وہ تھا کہ مکے کے لوگ آپ کو جادوگر کہہ کر بدنام کیا کرتے تھے اور جو بھی مکہ آتا تھا، اس کو یہ کہہ دینا اپنا فریضہ سمجھتے تھے کہ بھائی! مکے کے اندر ایک آدمی بہت بڑا جادوگر ہے؛ اس لیے تم کہیں بھی جاؤ ٹھیک ہے؛ لیکن اس جادوگر کے پاس نہ جانا، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس۔ انھوں نے اس بات کا خوب خوب پروپگنڈا کیا اور لوگوں میں بات پھیلا دی، چناں چہ لوگ آتے، تو سب سے پہلے ان کے کان بھر دیتے تھے اور ان کی باتوں کو حق سمجھ کر لوگ ڈر کے مارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے نہیں تھے۔ طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ میں بھی آیا تھا مکہ اور آیا تھا کسی اور مقصد سے، مکے کے لوگوں نے مجھ سے یہ کہا کہ یہاں ایک آدمی ہے، بڑا جادوگر ہے، تم اس کے قریب مت جانا۔ میں نے کہا کہ جادوگر ہے کیا کرتا ہے وہ؟ تو انھوں نے کہا کہ وہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے، جس سے سب لوگ اس کے ہو جاتے ہیں اور اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی باتوں کو حق سمجھا اور خیال کیا کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر کچھ جنات کا اثر ہو گیا ہوگا، یا اور کوئی بیماری کا اثر ہوگا، کہتے ہیں کہ میں ایک منتر پڑھا کرتا تھا، میں اس خیال سے ان کے پاس گیا کہ منتر پڑھ کر ان کے اوپر کے وہ اثرات ختم کر دوں گا۔ اس کے لیے ان کے پاس جانا ضروری سمجھا، کہتے ہیں کہ میں ان کے قریب گیا اور جا کر میں نے کہا کہ آپ کا کیا دعویٰ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میرا دعویٰ ہے «إني رَسُولُ الله» (میں اللہ کا رسول ہوں) انھوں نے کہا کہ اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھنا شروع کر دیا، طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ قرآن پڑھنے لگے، تو میں سنتا رہا، سنتا رہا، سنتا رہا؛ یہاں تک کہ میرا سارا

جادواتر گیا۔ (أسد الغابة:۳/۷۷)

دیکھا کہ آپ ﷺ پر منتر پڑھنے آئے تھے؛ لیکن خود کے اوپر کا جادواور خود کی برائی ختم ہوگئی، وہ کہتے ہیں کہ اس دن سے سارا کفر وشرک مٹ گیا اور اسی وقت میں نے کہا کہ مجھے بھی ایمان میں داخل کرلیجیے۔

دیکھیے! لوگ کیا کیا ارادے لے کر آتے تھے؟ یہاں تک کہ ایسے ارادے بھی لے کر آتے تھے کہ میں حضور ﷺ کی (نعوذ باللہ) اصلاح کردوں گا اور ان کے جادو کو اُتاردوں گا؛ لیکن جب اللہ کلام پڑھا جاتا تھا، تو اللہ کے کلام کی تاثیر رونما ہوتی تھی، ظاہر ہوتی تھی اور ان کے دلوں کے اندر نرمی ایسی پیدا ہوتی کہ خود کی اصلاح کر کے ایمان قبول کر کے جاتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے دل پر قرآن کا اثر

قرآن پاک کی تلاوت بالخصوص غور وفکر کے ساتھ، تدبر کے ساتھ؛ اگر کی جائے، تو اس سے دل کو بہت زیادہ نرم کرنے میں فائدہ ہوتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ بہت بڑے فقیہ تھے، بہت بڑے محدث تھے اور چار اماموں میں سے ایک امام ہیں اور بڑے اللہ والے بھی تھے، غور وفکر کے ساتھ قرآن پڑھتے تھے، احادیث پڑھتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دل بہت نرم ہوگیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے واقعات میں آتا ہے کہ حارث بن لبید رحمہ اللہ ، جو بڑی خوبصورت آواز رکھتے تھے اور قرآنِ کریم بڑے دل گداز انداز میں پڑھتے تھے؛ وہ ایک بار قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے ان آیات پر پہنچے، جو ﴿سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ﴾ میں ہیں:

﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾ (المرسلات: ۳۵-۳۶)

ان آیتوں کو جب امام شافعی رحمہ اللہ نے سنا، تو ان کا چہرہ متغیر ہو گیا اور وہ کانپنے لگے اور رونے لگے؛ یہاں تک کہ ان کی حالت یہ ہوگئی کہ بے ہوش ہو کر گر گئے؛ کیوں کہ اس کے اندر مضمون ہی ایسا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: "یہ قیامت کا دن ایسا ہول ناک دن ہے، جس دن کوئی بول نہیں پائے گا، بولنے کی سکت نہیں رکھے گا، اس قدر خوف ناک، ہیبت ناک اور وحشت ناک وہ دن ہوگا اور کچھ لوگ اگر بولنا بھی چاہیں گے؛ تو ان کو معذرت کے لیے کوئی موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ اپنی معذرت پیش کر سکیں، کہ میں نے کفر اس لیے کر دیا تھا، اے اللہ! میں نے شرک اس لیے کر لیا تھا، میں نے گناہ اس لیے کر دیا تھا؛ ان کو عذر و معذرت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ جب یہ آیتیں پڑھنے لگے، تو امام شافعی رحمہ اللہ پر حال طاری ہو گیا، دل کی نرمی کا یہ حال کہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔

(إحياء العلوم: ۱/ ۲۵)

معلوم ہوتا ہے بھائیو! کہ قرآن پاک اگر اس طرح پڑھا جائے، غور و فکر کے ساتھ، معانی پر توجہ کے ساتھ؛ تو دل پر ضرور بالضرور اس کا اثر ہوتا ہے۔

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ کے دل پر قرآن کا اثر

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ، جو بڑے اکابر محدثین و صوفیا اور بزرگوں میں سے ہیں، ان کے بڑھاپے کا عالم تھا، چل نہیں پا رہے تھے، چلنے کی طاقت نہیں تھی، پیر اٹھتا نہیں تھا، بیماریاں ان کو گھیرے میں لی ہوئی تھیں، ایسے بڑھاپے کی حالت میں وہ اپنے پیروں کے بل گھسٹتے ہوئے اپنے بیٹے کا سہارا لیتے ہوئے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے دروازہ پر آ گئے۔ حسن بصری اور میمون بن مہران

دونوں ہم عصر بزرگ تھے۔ دروازہ پر آئے اور دستک دی، باندی نے آکر پوچھا کہ کون ہیں؟ ان کے بیٹے کہنے لگے کہ یہ میرے والد حضرت میمون بن مہران ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ملنے آئے ہیں، ذرا اُن کو اطلاع کر دو، ملاقات ہو جائے۔ باندی کہنے لگی کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ اس بوڑھے کو کھینچ کر لے آیا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اتنے بوڑھے تھے کہ باندی کو اس کا احساس ہونے لگا کہ ایسے آدمی کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی؟ خود ہی آجاتے۔

انھوں نے کہا کہ نہیں! نہیں! ان ہی کو ملنا تھا؛ اس لیے میں نہیں آسکتا تھا، یہ اُن کی ضرورت تھی، یہی آنا چاہتے تھے۔ الغرض حسن بصری رحمہ اللہ کو اطلاع دی گئی اور ان کو اندر بلا کر بٹھایا گیا، حسن بصری رحمہ اللہ تشریف لائے خیر خیریت ہوئی، پوچھا کہ کیسے تشریف لائے؟ حضرت میمون نے کہا کہ حضرت! دراصل بات یہ ہے کہ دل میں ذرا سختی محسوس کر رہا ہوں، آپ کی خدمت میں آیا ہوں، کوئی ایسی بات کہہ دیجیے، جس سے دل کی سختی دور ہو جائے۔

ذرا سوچیے کہ حضرت میمون بن مہران بڑھاپے کے عالم میں ہیں اور خود کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، میمون بن مہران رحمہ اللہ تاریخ کی عجیب شخصیت ہیں، محدثین میں "تاج المحدثین" مانے جاتے ہیں، صوفیا میں ستارہ مانے جاتے ہیں، کوئی معمولی ہستی نہیں، اتنی بڑی ہستی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ دل میں سختی پا رہا ہوں، حسن بصری رحمہ اللہ نے کیا کہا ان کو؟ کچھ نہیں، بس قرآن پڑھنا شروع کر دیا، بس جناب! آیتیں پڑھنا تھا، دونوں کا ایسا عجیب حال ہوا کہ یہ بھی زور زور سے رونے لگے، وہ بھی زار و قطار رونے لگے، کچھ دیر تو بس رونے ہی کی مجلس قائم ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ کچھ دیر کے بعد جب وہ سنبھل گئے اور رونا ختم ہوا، تو

انھوں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی وجہ سے میرے دل کی سختی دور ہوگئی، اب اجازت دیجیے کہ واپسی چاہتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کو دلوں کی سختی کا بڑا احساس بھی ہوتا تھا، بزرگوں کے پاس آتے، پوچھتے حضرت! بتایئے کہ دل کو نرم کیسے کروں؟ اور دل کی سختی کو دور کیسے کروں؟ آج ہمارے دلوں میں اس لیے نرمی نہیں پیدا ہو رہی ہے کہ سختی کا احساس بھی نہیں ہے؛ اس لیے سختی انتہا درجہ کو پہنچ گئی ہے اور مذکورہ واقعے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ تلاوتِ قرآن سے دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔

عتبہ بن ربیعہ کے دل پر قرآن کا اثر

سیرت کا مشہور واقعہ ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں عتبہ بن ربیعہ کافروں کی طرف سے قاصد بنا کر بھیجا جاتا ہے، وہ اللہ کے نبی کے پاس آتا ہے اور آ کر کہتا ہے کہ مجھے مکے کے سرداروں نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور ایک پیغام دے کر بھیجا ہے، آپ نے فرمایا کہ کیا پیغام ہے؟ کہنے لگا کہ مجھے یہ پیغام دیا ہے کہ میں آپ کے سامنے یہ بات رکھوں، کہ آپ جو یہ دین کے نام سے ہمارے بتوں کے خلاف سازش چلا رہے ہیں اور ایک اللہ کی بات لوگوں کے سامنے رکھتے جا رہے ہیں۔ ہمارے مکے کے سرداروں کا کہنا ہے کہ اگر آپ کا مقصود اس سے یہ ہے کہ آپ یہاں کے حاکم اور بادشاہ بن جائیں، تو ہم آپ کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں اور آپ کو ہم اپنا حاکم اور فرماں روا تسلیم کر لیں گے اور پھر کہنے لگا کہ سرداروں نے یہ کہا کہ اگر آپ کا مقصد اس دین کی دعوت سے مال پیسہ جمع کرنا ہے، تو ہم سونے اور چاندی کے خزانے آپ کی خدمت میں لا کر ڈال دیں گے؛ لہٰذا آپ یہ چھوڑ دیجیے اور پھر اس نے کہا کہ ہمارے سرداروں کا کہنا ہے کہ اگر

آپ کا مقصد اس دین کی دعوت سے اور تحریک سے اگر یہ ہے کہ دنیا میں آپ بڑے بنے رہیں، تو ہم آپ کو اپنا بڑا بنالیں گے اور کوئی کام آپ کے حکم کے بغیر نہیں کریں گے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اس کام کو چھوڑ دیں، اس دین کی تحریک کو چھوڑ دیں۔

ان تین باتوں میں سے کسی ایک کو بھی قبول کر لیجیے، آپ حاکم بننا چاہیں، تو ہم حاکم بنالیں گے، مال دار بننا چاہیں، تو آپ کو سونا و چاندی دے کر آپ کو مال دار بنادیں گے اور آپ کو امارت چاہیے، تو امیر بنالیں گے۔

جب وہ خاموش ہوا، تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھاری بات ختم ہوگئی؟ اس نے کہا ہاں! ختم ہوگئی، اس کا جواب چاہتا ہوں۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب کے اندر ''سورۂ حم السجدۃ'' کی تلاوت شروع فرما دی، یہی جواب تھا، حضور کی طرف سے، ''سورۂ حم السجدۃ'' تلاوت کرتے چلے جارہے ہیں، اس کے اندر قومِ عاد اور قومِ ثمود اور پچھلی قوموں کا تذکرہ آیا ہے اور اس کے اندر یہ بھی کہا جارہا ہے کہ دیکھو! پچھلے لوگوں پر اللہ کی طرف سے کیسے کیسے عذابات آئے؟ جب آپ پڑھ رہے تھے، وہ اپنی پیٹھ کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور سنتا رہا اور پھر اپنی قوم سے کہنے لگا کہ میں نے تمھاری باتیں ان کو سنائی، تو اُنھوں نے ایک ایسا کلام پیش کیا، کہ خدا کی قسم! میرے کانوں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا۔

(دلائل النبوۃ لأبي نعیم:۱/۲۱۳، سیرۃ ابن ھشام:۱/۱۳۱)

اب اندازہ کرو کہ اتنے بڑے کافر کے دل پر اثر انداز ہونے والا: اللہ کا یہ کلام اپنے اندر کیسی تاثیر رکھتا ہوگا؟ لیکن آج ہم لوگ قرآن ہی نہیں پڑھتے، بہت سارے ایسے ہیں کہ پورا پورا سال ہو جاتا ہے؛ لیکن قرآن اٹھا کر نہیں دیکھتے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ حافظِ قرآن ہو کر بھی نہیں پڑھتے، بھائیو! اللہ

کا کلام پڑھیے، اللہ کا کلام کبھی سنیے، اچھے اچھے قاریوں سے سنیے اور دل جمعی کے ساتھ پڑھیے اور اس کے مضامین پر نگاہ ڈالتے ہوئے پڑھیے، ذرا توجہ کر کے پڑھیے، پھر دیکھیے کہ اللہ کے اس کلام کا کرشمہ کیسے ظاہر ہوتا ہے؟

قرآن کا اثر کفارِ مکہ کے دلوں پر

سیرت کا بہت مشہور واقعہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا معمول رات میں اپنے گھر کے اندر نماز پڑھنے کا تھا اور اس میں عام طور پر قرآنِ پاک جو پڑھتے تھے، ذرا آواز سے پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق: تین مکے کے بڑے بڑے سردار ایک دوسرے سے چھپ کر اللہ کے نبی ﷺ کے مکان کے کسی کونے میں آکر بیٹھ کر قرآن سنتے تھے، اللہ کے نبی ﷺ قرآن پڑھتے جا رہے ہیں، روتے جا رہے ہیں، ہچکیاں بندھ گئی ہیں، عجیب عجیب کیفیتیں ظاہر ہو رہی ہیں اور یہ لوگ اللہ کا کلام سننے کے لیے اور اس کی لذت وشیرینی اور مٹھاس کو محسوس کرنے کے لیے اپنی راتوں کی نیند کو قربان کر کے آئے ہوئے ہیں۔

ذرا سوچنے کی ضرورت ہے کہ یہ لوگ تو ویسے بھی عیاش، شراب کے عادی، راتوں کو تو ضرور شراب پیتے ہوں گے؛ لیکن اپنی شراب چھوڑ دی، اپنی نیند بھی قربان کر دی، راحت ترک کر دی اور قرآن سننے چلے آئے۔

جب صبح کا وقت ہوتا تھا، تو یہ لوگ آہستہ سے نکل کر واپس ہو جاتے تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب نکل کر جانے لگے؛ تو تینوں کی ایک موڑ پر آکر ملاقات ہوگئی، اب ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے، آپس میں کہنے لگے کہ ایسا ہے کہ ہم کو اس قرآن نے بے چین کر دیا تھا، رات کی نینداس نے حرام کر دی ہے، ہم

یہاں قرآن سننے کے لیے آئے ہیں۔ پھر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ دیکھو ہم ہی ایسا کرنے لگیں گے، تو پھر دوسرے لوگ کیا کریں گے؟ ہمیں تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

چناں چہ تینوں نے وعدہ کرلیا اور کہا کہ کل سے پھر ایسی حرکت نہیں ہوگی اور سب واپس ہوگئے، جب رات ہوئی، تو سب کو پھر بے چینی شروع ہوگئی، قرآن سننے کے لیے تڑپ پیدا ہوگئی اور اندر سے حرص پیدا ہوگئی، رات کو نیند نہیں آتی، کروٹیں بدل رہے ہیں؛ ابوجہل سوچنے لگا کہ ان دونوں نے تو وعدہ کیا ہے کہ نہیں آئیں گے؛ اس لیے وہ دونوں تو نہیں آئیں گے، میں چلا جاتا ہوں اور ابوسفیان نے یہ سوچا کہ ان دونوں نے تو مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ دونوں نہیں آئیں گے؛ اس لیے وہ دونوں تو نہیں آئیں گے، میں جاؤں گا تو کسے پتہ چلے گا؟ اور وہ اخنس بن شریق کہنے لگا کہ وہ دونوں تو نہیں آئیں گے، میں چلا جاؤں گا، تو کیا پتہ چلے گا؟ تینوں نے اسی طرح سوچا اور تینوں پھر جمع ہوگئے اور صبح میں پھر ملاقاتیں ہوگئی، پھر آپس میں ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے لگے، اسی طرح دو تین دفعہ ہوا۔ اندازہ کرنا چاہیے کہ ان کے دلوں کو قرآن نے کس قدر موم بنادیا تھا۔

(الخصائص الکبری:۱/ ۲۶۸، سیرۃ ابن ھشام:۱/ ۱۵۷)

اسی لیے قرآن نے کہا ہے:

﴿وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ﴾ (النمل:۱۴)

(یہ سب یقین رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، ان کے دلوں کو اس کا پورا پورا یقین ہے اور اطمینان ہے؛ لیکن اس کے باوجود محض تکبر کی بنا پر اس کا انکار کرتے ہیں۔)

بھائیو! اس سے بتانا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ اللہ کے کلام کی تاثیر کافروں کے دلوں پر بھی ہو رہی ہے، اگر قرآن اثر نہ کرتا، تو کفار قرآن سننے اس طرح بے تاب

کیوں ہوتے ؟ بھائیو! جب اللہ کا پاکیزہ کلام کافروں پر بھی اثر کرسکتا ہے، تو مسلمانوں پر کیوں نہیں کرے گا؟

کثرتِ تلاوت اور حضرت شاہ عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ کا ذکر

لہٰذا قرآن پڑھنے کا معمول بنائیں، جو حافظِ قرآن ہیں، وہ کم از کم ایک پارہ پڑھیں، اللہ نے آپ کو حافظ بنایا، کتنی بڑی خدا کی دولت ہے؟ اس سے بڑی کوئی دولت ہے؟ بہت ہی عظیم الشان دولت ہے، اللہ کی بہت بڑی عنایت ہے، اس عنایت کی قدر یہ ہے کہ اسے روزانہ پڑھیں۔

ہمارے جامعہ: ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور'' میں ایک مرتبہ حضرت مولانا شاہ عبد اللطیف صاحب رحمہ اللہ تشریف لائے، جو دلی کی لال مسجد میں رہتے تھے۔ آپ حضرت مولانا اسد اللہ صاحب رحمہ اللہ کے اجلِ خلفا میں سے تھے اور بڑے صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے۔ جب آپ سے لوگ ملنے لگے، ہمارے مدرسے کے اساتذہ وطلبہ بھی ملنے لگے، تو حضرت نے ہر ایک سے معلوم کرنا شروع کیا کہ روزانہ کتنے پارے پڑھتے ہو؟ کسی نے کہا آدھا پارہ؛ کسی نے کہا: ایک پارہ؛ کسی نے کہا: ڈیڑھ پارہ۔ حضرت بہت ناراض ہوئے اور کہا: علما ہو کر، حفاظ ہو کر یہ حال ہے؟ کم سے کم پانچ پارے ضرور پڑھنا چاہئیں اور میں نے خود حضرت کو دیکھا ہے، ان کا پورا دن قرآن پڑھتے ہوئے گذرتا تھا۔

آپ اپنی مصروفیات کی وجہ سے پانچ پارے نہیں پڑھ سکتے، تو کیا بھائی دو پارے بھی نہیں پڑھ سکتے؟ ارے ایک پارہ بھی نہیں پڑھ سکتے؟ کم سے کم ایک پارہ تو پڑھنا چاہیے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو قرآن ہی اٹھا کر نہیں دیکھتے، یہ بہت ہی محرومی کی بات ہے؛ اس لیے قرآن پڑھنے کا معمول بناؤ اور جو عوام الناس ہیں،

ان سے بھی میری گذارش ہے اور جو حفاظ و علما ہیں، ان سے بھی میری گذارش ہے کہ اپنی اپنی حیثیت سے معمول مقرر کر لیں کہ ہم کو ضرور اتنا قرآن پڑھنا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کہتے ہیں کہ جب بندہ قرآن پڑھتا ہے، تو اللہ اس طرح سنتے ہیں جیسے کوئی گانے والی گاتی ہے، تو اس کا مالک اس کو سننے کے لیے متوجہ ہوتا ہے۔

(مسند أحمد:۲۳۹۴۷/ ج:۳۹)

پہلے زمانے میں گانے والیاں ہوتی تھیں، ایسی عورتوں کو گانا سننے کے شوقین لوگ اپنے پاس رکھا کرتے تھے، وہ ان سے گانا سنتے تھے۔ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والا جب قرآن پڑھتا ہے، تو اللہ اسی طرح اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے ہیں، جیسے گانے کا شوقین آدمی گانے والی عورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

لہٰذا جب قرآن پڑھو، تو یہ خیال کرو کہ اللہ کا کلام ہے اور دوسرے یہ خیال کرو کہ اللہ سن رہے ہیں۔ جب اس تصور کے ساتھ قرآن کی تلاوت ہوگی؛ تو اندازہ کریں کہ دلوں پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا؟ دل کے اندر کس قدر گداز پیدا ہوگا اور نرمی پیدا ہوگی؟

دلوں کو نرم کرنے کا دوسرا نسخہ — ذکر اللہ

اس کے بعد دیکھیے دوسری چیز کو، جس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے اور سختی دور ہوتی ہے اور وہ ہے اللہ کا ذکر۔ اللہ کا ذکر بار بار کرتے رہیں، تو ان شاء اللہ دل کے اندر نرمی آئے گی؛ اس لیے کہ یہ اس کی خاصیت ہے۔

ہر چیز کی ایک خاصیت ہوتی ہے، زہر کی خاصیت، حلوے کی خاصیت، ٹانک

کی خاصیت اور بادام اور حلوے کی خاصیت؛ ہر چیز کی ایک ایک خاصیت ہوتی ہے، اسی طرح اللہ کے ذکر کی بھی ایک خاصیت ہے۔

اور اللہ کے ذکر کی ایک ہی نہیں؛ بل کہ بہت سی خصوصیات ہیں، ان میں سے بہت اہم خصوصیت تو یہی ہے کہ اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے؛ اسی لیے بزرگوں کو یہ دیکھا گیا ہے کہ سب سے زیادہ نرم دل تو وہی ہوتے ہیں؛ کیوں؟ اس لیے کہ سب سے زیادہ اللہ کا ذکر وہی کرتے ہیں۔ جو چوبیس گھنٹے اللہ کا ذکر ہی کرتے رہتے ہوں، ان کے دلوں میں نرمی نہیں تو اور کیا ہوگی؟ نرمی اتنی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں پر رحم و کرم کرتے ہیں اور دیگر مخلوقات پر بھی رحم و کرم کرتے ہیں۔

ذکر سے دل میں نرمی کیوں آتی ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ ذکر اللہ سے دل میں نرمی آنے کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ ذکر سے اللہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور جس سے تعلق پیدا ہوتا ہے، اس کی صفات آدمی میں منتقل ہوتی ہیں؛ لہٰذا اللہ کی صفات میں سے سب سے بڑی صفت اور اہم صفت رحم و کرم ہے؛ لہٰذا یہ صفت بندے میں آجاتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس ایک آدمی آکر کہنے لگا کہ حضرت! میرے دل میں بڑی سختی معلوم ہوتی ہے، اس کے لیے کوئی علاج بتائیے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اس آدمی کو لے جاؤ اور جہاں ذکر کی مجلس ہو، وہاں اس کو بٹھا دو؛ پھر کہا:

" مجلس الذكر محياة العلم ، و يُحدِثُ في القلب الخشوع ، القلوب الميتة تُحيَا بالذكر كما تُحيا الأرض الميتة بالقطر."
(دیکھو: لطائف المعارف:١٦)

(ذکر کی مجلس علم کو زندہ کرتی اور دلوں میں خشوع پیدا کرتی ہے، مردہ دل ذکر سے اس طرح زندہ ہو جاتے ہیں، جس طرح مردہ زمین بارش سے زندہ ہو جاتی ہے۔)

ایک اور موقع پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت! میں آپ کی خدمت میں دل کی سختی کا شکوہ لے کر آیا ہوں۔ آپ نے کہا:

" أدبه من الذكر. "(شعب الإيمان:٦٩١)

(ذکر سے اپنے نفس کی تادیب کرو!)

ایک عورت حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں آئی اور عرض کرنے لگی کہ جب میں ذکر کی مجلس میں جاتی ہوں، تو میرا دل نرم ہو جاتا ہے اور جب میں جانا چھوڑ دیتی ہوں، تو میرے دل کا حال برا ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جہاں تیرے دل کی اصلاح ہوتی ہے؛ وہاں جایا کر!!

(شعب الإيمان:٢/٦٩٠)

الغرض ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دل میں رقت و نرمی پیدا ہوتی ہے اور سختی نکل جاتی ہے۔

کثرتِ ذکر کا حکم

اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے عقل مندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَاماً وَّ قُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾(آل عمران :١٩١)

(عقل مند وہ لوگ ہیں، جو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے؛ کسی وقت بھی وہ اللہ کو نہیں بھولتے؛ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے

رہتے ہیں۔)

ایک اور جگہ اللہ نے قرآن میں حکم دیا ہے:

﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اذْكُرُوْا اللّٰهَ ذِكْراً كَثِيْراً﴾ (الأحزاب: ۴۱)

(اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو!)

اور ''کثرت'' کسے کہتے ہیں؟ ایک بزرگ نے کہا کہ ایک آدمی کے پاس ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور چوبیس میں سے ''اکثر'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تین حصے کر کے دو حصوں میں ذکر کرو، چوبیس گھنٹوں کو آپ تین حصوں میں تقسیم کریں تو کتنے ہوں گے؟ آٹھ آٹھ گھنٹے، تین میں تقسیم ہو گئے، تو دو حصوں میں یعنی سولہ گھنٹے اللہ کا ذکر کرو، تب جا کر کثرتِ ذکر ہوگا اور آٹھ گھنٹے آپ ذکر کریں، سولہ گھنٹے نہ کریں؛ تو یہ قلتِ ذکر ہوگا۔ اور اللہ کا حکم کیا ہے؟ کثرتِ ذکر کا۔

خوجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

لب پہ ذکر اللہ کی تکرار ہو ۔۔۔۔ دل میں ہر دم حق کا استحضار ہو

اس پہ تو کر لے اگر حاصلِ دوام ۔۔۔۔ پھر تو بس کچھ دن میں بیڑا پار ہو

کثرتِ ذکر کا آسان طریقہ

مگر یہاں آپ پریشان نہ ہوں کہ کثرتِ ذکر کا اگر یہ مطلب ہے کہ سولہ گھنٹے ذکر میں لگائیں، تو ہم یہ کام کیسے پورا کر سکیں گے؟ اللہ نے اس کے لیے بڑی آسانی کردی۔ آسانی یہ کردی کہ دین کا جو بھی آپ کام کریں، اس میں نیت اللہ کی رضا کی کر لیجیے، ذکر ہو جائے گا، آپ نماز پڑھیں، تو نماز بھی ذکر ہے اور آپ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں، تو وہ بھی ذکر ہے، مدرس صاحب پڑھانے بیٹھے ہوئے ہیں، نیت کر کے پڑھانے کے لیے بیٹھیں، تو ان کے پڑھانے کا پورا وقت ذکر ہے۔ علما

کے لیے تو بہت آسان ہے؛ اس لیے کہ وہ تو دن بھر پڑھنے پڑھانے میں لگے رہتے ہیں؛ لہٰذا اپنے پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و تالیف، وعظ و نصیحت، بیان و خطاب؛ سب کے اندر رضائے خداوندی کی نیت کرلیں، یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہو جائے گا۔

یہ طریقہ تو علما کے لیے ہے اور ایک طریقہ وہ ہے، جس سے علما بھی اور عوام بھی دونوں کو کثرتِ ذکر اللہ حاصل ہو سکتا ہے: وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو یاد کرلیں، سنتوں کو یاد کرلیں: کھانے کی دعا، پینے کی دعا، بیت الخلا آنے جانے کی دعا؛ جب یہ سارے کام دعاؤں کے ساتھ سنت کے مطابق انجام پذیر ہوں، تو یہ سب کام ذکر میں شامل ہو جائیں گے۔ اسی طرح صبح سے شام تک کے ہمارے سارے اعمال و افعال سنت کے مطابق اور دعاؤں کے ساتھ ہوتے رہیں گے، تو یہ سب کام بھی ذکر اللہ میں شامل ہو جائیں گے۔

سونا و جاگنا، کھانا و پینا، باہر جانا و آنا، بیت الخلا جانا و آنا، کپڑے پہننا و نکالنا، جوتے پہننا و نکالنا، بازار جانا و آنا، تجارت و ملازمت کرنا، کسی سے ملنا و بات چیت کرنا، شادی و غمی؛ الغرض ہر موقع پر دعاؤں کا اہتمام کرلیا جائے، تو ہمارا اکثر وقت ذکر اللہ میں لگ جائے گا۔ اب بتائیے کہ ہمارا مسئلہ آسان ہو گیا یا نہیں؟ بہ ہر حال ذکر کا اہتمام بھی دلوں کو نرم بناتا ہے۔

ذکر اللہ دو کام کرتا ہے

ذکر اللہ دو طرح کا کام کرتا ہے: دل اگر ناپاک ہے تو اسے پاک بناتا ہے اور اگر وہ پاک ہے، تو اس کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ ہے تو ایک ہی چیز؛ لیکن کام دو کرتا ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے بعض اطبا کے یہاں بنے ہوئے حلوے ہوتے ہیں، ان میں سے بعض حلوے ایسے ہوتے ہیں کہ جب آدمی بیمار ہوتا ہے اور اس کو

کھاتا ہے، تو بیماری کو نکالے گا اور پھر اس کے بعد بھی جاری رکھے گا؛ تو قوت دے گا۔ دیکھیے! حلوہ تو ایک ہی ہے؛ لیکن کام دو کرتا ہے۔ جس طریقے پر دنیا کے یہ حلوے بہ یک وقت دو کام کرنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح ''اللہ کا ذکر'' بھی ایک حلوہ ہے، جب تک آپ بیمار ہیں، اس کو کھائیں گے؛ تو بیماری دور ہوگی، روحانی بیماری، گندگی و آلائش و ناپاکی دل سے نکلتی رہے گی اور اس کے بعد بھی ذکر اللہ جاری رہے، تو دل کے اندر دوسری خوبیاں اور کمالات پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ تو علما لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے تو یہ ہونا چاہیے کہ ذکر اللہ کثرت کے ساتھ کریں۔

ذکر اللہ کا اصل فائدہ، ترکِ معصیت پر موقوف

اس تفصیل سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ذکر اللہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ آدمی کے اندر کی بیماری نکالتا ہے اور اس کو گناہ چھوڑنے پر آمادہ کرتا ہے، اب ایک اور ضروری بات سن لیں: وہ یہ کہ ذکر اللہ کا اصل فائدہ تو اس وقت ملے گا، جب آدمی گناہ چھوڑنے کا عزم کر کے ذکر کرے گا؛ ایسا نہ ہو کہ ایک طرف گناہ بھی جاری اور ایک طرف ذکر بھی جاری ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ کٹورے کے اندر روزانہ گندگی بھی جمع کر رہا ہے اور اس کے اندر شربت بھی ڈال رہا ہے۔ غور کیجیے کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ جب ایک طرف سے گندگی بھی جمع کر رہا ہے، آنکھ سے گندگی، کانوں سے گندگی، ہاتھوں اور پیروں سے گندگی دل میں جمع کر رہا ہے اور دوسری طرف ذکر بھی کر رہا ہے، تو ذکر کا فائدہ اس سے نہیں معلوم ہوگا۔

عام طور پر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ایک طرف ذکر بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف گناہ بھی کرتے ہیں۔ دل کو دھونا ہو، صاف کرنا ہو؛ تو پہلے گناہوں کو ترک

کر دینا چاہیے اور جو گندگی وغلاظت پہلے سے جمع ہے، اس کو صاف کرنے کے لیے ذکر کریں؛ تو ان شاء اللہ ذکر کی برکت سے وہ ساری گندگی وناپاکی دور ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا سلوک کی سب سے پہلی منزل ترکِ معصیت اور توبہ ہے، اس کے بغیر آگے کی منزلیں کبھی طے نہیں ہوسکتیں، اگر گناہوں سے توبہ نہیں کیا اور چل رہا ہے، تو چلے گا چلے گا؛ لیکن جب رات ہوجائیگی، پھر صبح اٹھے گا؛ تو جہاں سے چلا تھا، وہیں پر ہوگا۔ اسی طرح بھائیو! جب سالک اللہ کی راہ میں چلے گا، تو اسے گناہوں کو چھوڑ کر آگے بڑھنا ہوگا، اگر وہ گناہوں کے ساتھ آگے بڑھے گا، تو کبھی منزل تک نہیں پہنچ پائے گا، صبح سے چلے گا شام تک، شام سے صبح تک؛ لیکن ہوگا وہیں، جہاں سے وہ چلا تھا۔

ایک فقہی مثال سے توضیح

اس کی مثال ایسی ہے، جیسے اگر کنویں میں چوہا گر گیا، تو علما لکھتے ہیں کہ بیس ڈول پانی نکالنے سے وہ کنواں پاک ہوجائے گا، اگر کسی کنویں میں کوئی کتا گر گیا، تو اس میں سے پورا پانی نکالنے پر کنواں پاک ہوسکتا ہے۔ اگر کسی صاحب نے چوہا گرنے پر بیس ڈول پانی نکال دیا؛ لیکن چوہا اندر کا اندر ہی ہے، چوہے کو نہیں نکالا، اسی طرح کتے کے گرنے پر پورا کنواں خالی کر دیا، لیکن کتے کو باہر نہیں نکالا، پھر اس کے اندر سے پانی آنا شروع ہوگیا؛ تو نکالنے والے بے وقوف نے سوچا کہ میں نے پورا کنواں خالی کر دیا ہے اور اب میرا پورا کنواں پاک ہوگیا، صاف ہوگیا۔

حالاں کہ اس نے اس کتے یا چوہے کو نہیں نکالا، جس کی وجہ سے کنواں خراب ہوا تھا، تو اب بتائیے کہ کتے کو نکالے بغیر، یا چوہے کو نکالے بغیر، کنواں کیسے پاک ہوسکتا ہے؟

اسی طرح دل کے کنویں میں معصیت و گناہوں کی نجاست پڑی ہوئی ہو اور آپ اس کو صاف کرنے کے لیے ذکر اللہ کا ڈول ڈال کر پانی نکال دیں؛ لیکن اندر گناہوں کی غلاظت و نجاست ویسی ہی پڑی رہے، یعنی گناہ کو نہیں چھوڑ رہا ہے، گناہ برابر جاری ہے اور اوپر سے ذکر اللہ سے پانی بھی نکال رہا ہے، کیسے کنواں پاک وصاف ہوگا؟ جیسے وہاں مرے ہوئے کتے یا چوہے کو نکالے بغیر کنواں پاک وصاف نہیں ہوتا، اسی طریقے پر یہاں گناہوں کی نجاست کو باہر نکالے بغیر یہ دل بھی پاک وصاف نہیں ہوسکتا۔

تو پہلے ہر قسم کے گناہوں کو چھوڑنے اور ان سے توبہ واستغفار کرنے کے بعد ذکر اللہ اپنا کام کرتا ہے۔

کیا گناہ چھوڑنے سے پہلے ذکر نہ کریں؟

یہاں یہ عرض کردوں کہ میری اس بات سے یہ نہ سمجھیں کہ جب تک گناہوں کو نہ چھوڑ دیں، اس وقت تک ذکر اللہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ مطلب نہیں ہے؛ بل کہ یہ بتانا ہے کہ ذکر اللہ کا فائدہ گناہ چھوڑنے والے کو ہوگا اور جو گناہ نہ چھوڑے، اس کو ذکر اللہ کا فائدہ نہیں ملے گا۔ باقی ذکر اللہ تو سبھی کو کرنا چاہیے، گنہ گار بھی ذکر اللہ کرے اور نیک لوگ بھی ذکر اللہ کریں۔ اور ہوسکتا ہے کہ ذکر اللہ کی برکت سے گناہ بھی چھوٹ جائیں۔ یہاں ہماری تقریر سے ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ذکر اللہ کا اصل فائدہ آدمی کو اس وقت ملتا و حاصل ہوتا ہے، جب وہ گناہوں سے باز آجاتا ہے۔

دلوں کو نرم کرنے کا تیسرا نسخہ — موت کی یاد

تیسری بات دل کو نرم کرنے کی یہ ہے کہ موت کا مراقبہ کیا جائے، آج کل

لوگوں کو موت کے لفظ سے بڑا ڈر لگتا ہے، جی! موت تو ڈرنے ہی کی چیز ہے؛ لیکن موت کے ذکر سے نہیں، بل کہ خود موت سے ڈرنا چاہیے۔ لوگ موت سے تو ڈرتے نہیں؛ اسی لیے گناہ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ضائع کرتے ہیں اور مخلوق کے بھی ضائع کرتے ہیں۔ ہاں! موت کے ذکر سے ڈرتے ہیں، حالاں کہ یہ بے وقوفی کی بات ہے؛ اس لیے کہ موت سے تو کوئی چارۂ کار نہیں، اس سے تو چھٹی کسی کو نہیں، نہ امیر کی، نہ فقیر کی، نہ عالم کی، نہ جاہل کی، نہ بادشاہ کی، نہ رعایا کی؛ کسی کو موت سے مفر نہیں، موت آنی ہے، تو آ کر رہے گی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ موت کا ذکر کریں گے، تو موت آجائے گی، حالاں کہ موت اپنے مقررہ وقت پر آئے گی اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔

مجذوب رحمہ اللہ کے "موت اور فکرِ آخرت پر" چند اشعار

حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہے یہاں سے تجھ کو جانا ایک دن قبر میں ہوگا ٹھکانا ایک دن
منہ خدا کو ہے دکھانا ایک دن اب نہ غفلت میں گنوانا ایک دن

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

آخرت کی فکر کرنی ہے ضرور جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے ضرور
عمر یہ اک دن گذرنی ہے ضرور قبر میں میت اترنی ہے ضرور

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

سرکشی زیرِ فلک زیبا نہیں دیکھ جانا ہے تجھے زیرِ زمیں

جب تجھے مرنا ہے اک دن بالیقیں   چھوڑ فکرِ این و آں، کر فکرِ دیں

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

بہر غفلت یہ تیری ہستی نہیں   دیکھ! جنت اس قدر سستی نہیں
رہ گزر دنیا ہے یہ بستی نہیں   جائے عیش و عشرت و مستی نہیں

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

موت سے کوئی مفر نہیں

ایک حدیث یاد آئی، جس میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ موت سے بھاگنے والے کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک لومڑی نے ایک دفعہ زمین سے قرض لیا، بہت زمانے کے بعد ایک دن زمین نے لومڑی سے کہا کہ اے لومڑی! فلاں وقت تو نے مجھ سے قرض لیا تھا، میرا قرض واپس کر، تو لومڑی قرض واپس کرنا نہیں چاہتی تھی، اس نے بھاگنا شروع کر دیا، بھاگتے بھاگتے تھک گئی، بہت دوور جانے کے بعد جب ٹھیر گئی، تو ٹھیرتے ہی زمین تو نیچے تھی ہی، اس نے کہا: لاؤ! میرا قرض، تو اس نے پھر بھاگنا شروع کر دیا اور بھاگتی رہی بھاگتی رہی، کہاں تک بھاگے گی؟ اسی زمین پر تو بھاگے گی، بھاگتے بھاگتے بہت دور جانے کے بعد اپنے سوراخ میں داخل ہوگئی، تو پھر زمین نے کہا: لاؤ! میرا قرض، تو وہ پھر بھاگنے لگی اور یہاں تک کہ اس کی گردن جدا ہوگئی اور وہ مرگئی۔

(المعجم الكبير للطبراني:٦٩٢٢)

مطلب اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ہے کہ موت سے بھاگنے والے کی

مثال بھی ایسی ہی ہے، جیسے لومڑی زمین سے بھاگ کر کسی اور جگہ نہیں جا سکتی، اسی طریقے پر کوئی آدمی موت سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا، موت تو ایسی چیز ہے، کہ کیسا بھی محل بنا کر رہ جایئے، موت کا فرشتہ وہاں بھی آ جائے گا۔

جب کسی کو بھی موت سے مفر نہیں، تو کرنا کیا چاہیے؟ اس کا جواب اکبر الہ آبادی نے خوب دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر
بہتر ہے یہی کہ خوشی سے مرنا سیکھو

تم کہیں بھی رہو؛ موت آئے گی - ایک عجیب واقعہ

یہاں ایک آیت اور اس کے ساتھ ایک حیرت انگیز واقعہ یاد آ گیا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت سے کسی کو مفر نہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

﴿ أَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْكُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ (النساء: ۷۸)

(جہاں کہیں تم رہو گے؛ موت تمھیں آ پکڑے گی، اگر چہ مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ رہو۔)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی اسی آیت کے تحت علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے حوالے سے اس کو ذکر کیا ہے: وہ یہ کہ کسی پرانے زمانے کا واقعہ ہے کہ

ایک آدمی کسی گھر میں ملازم تھا، غلام تھا، اس گھر میں رات کے وقت ایک لڑکی کی پیدائش ہوئی اور جو چراغ جل رہا تھا، اتفاق سے بجھ گیا، تو لوگوں نے کہا کہ چراغ جلاؤ، تو وہ غلام چراغ جلانے باہر نکلا، جب باہر نکلا، تو دروازے پر ایک آدمی سے اس کی ملاقات ہوگئی، اس آدمی نے کہا کہ کہاں جارہے ہو؟ کہا کہ چراغ جلانے جارہاہوں، گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی ہے؛ لیکن چراغ گل ہوگیا، معلوم نہیں کیسی بچی ہے کہ چراغ ہی گل ہوگیا، تو اس نے کہا کہ وہ بچی جو اُبھی پیدا ہوئی ہے، یہ ایسی ہے کہ دنیا کی حسین ترین عورت ہوگی؛ لیکن ایک سو آدمیوں سے زنا کرے گی اور اس لڑکی کی موت مکڑی کے کاٹنے سے ہوگی۔

یہ سن کر اس غلام کو طیش آ گیا، وہ غلام گھر واپس گیا اور یہ سوچ کر کہ ایسی لڑکی کے جینے سے تو مرنا اچھا ہے، اس نے چھری اٹھائی اور اس بچی کے پیٹ میں گھونپ دیا اور مار کر باہر نکل گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ کس نے یہ حرکت کی ہے؛ کیوں کہ وہاں چراغ نہیں تھا اور اندھیری چھائی ہوئی تھی اور یہ غلام وہاں سے یہ سمجھ کر چلا گیا کہ میں تو اُسے مار چکا ہوں، وہ مرگئی ہوگی، لوگ مجھے تلاش کرنے لگ جائیں گے؛ اس لیے وہاں سے راہ فرار اختیار کر کے کسی اور ملک میں وہ پہنچ گیا اور ادھر جب لوگوں نے دیکھا کہ کسی نے بچی کو مار کر زخمی کر دیا ہے، تو انھوں نے ڈاکٹروں کو بلایا، جو علاج معالجہ کرنا تھا انتظام کیا؛ یہاں تک کہ اللہ کی قدرت وحکمت سے وہ بچی ٹھیک ہوگئی اور اس کی جان بچ گئی اور پل بڑھ کر وہ جوان ہوگئی۔

اور وہ غلام کسی اور ملک کے اندر کمائی کر رہا تھا، اس نے وہاں خوب کمایا اور مال دار بن گیا۔ اب اس کو خواہش ہوئی کہ شادی کرے، تو اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے شادی کرنی ہے اور ایک لڑکی کی ضرورت ہے، جو حسین ہو، خوب صورت ہو، دنیا کی

بہترین لڑکی ہو، ایسی لڑکی تلاش کر کے مجھ سے شادی کراؤ، اب لوگوں نے تلاش کیا اور ان کو ایک لڑکی کے بارے میں معلوم ہوا، تو انھوں نے کہا کہ ایک جگہ ایک لڑکی ہے، بہت حسین ہے، خوب صورت ہے، تمھارے لیے بہت مناسب ہے۔

الغرض جب اس کو ان لوگوں کی بتائی ہوئی لڑکی پسند آ گئی، تو اس نے اس سے شادی کر لی اور وہ لڑکی اسے بہت پسند آئی؛ اس لیے کہ وہ بہت ہی حسین وجمیل تھی اور وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ایک دن شوہر کی نگاہ بیوی کے پیٹ پر پڑی، تو دیکھا کہ ایک گہرا نشان ہے، اس نے پوچھا کہ تمھارے پیٹ پر یہ کیا نشان ہے؟ اس نے کہا کہ جب میں پیدا ہوئی تھی، تو کسی آدمی نے میرے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا تھا اور میں مرنے لگی تھی؛ مگر اللہ کا فضل وکرم ہوا کہ ڈاکٹروں سے علاج کرا کے میرے خاندان والوں نے میری جان بچالی تھی اور میں بڑی ہوگئی؛ لیکن وہ نشان ویسے ہی باقی ہے۔

یہ سن کر اسے فوراً یاد آ گیا کہ میں نے بھی ایک پیدا ہونے والی بچی کو چھرا گھونپ دیا تھا؛ لہٰذا اس سے اس کا پتہ، اس کے ماں وباپ وغیرہ کے بارے میں تفصیل پوچھنے لگا اور جب اس نے معلوم کر لیا اور یقین ہو گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے، تو اس نے کہا کہ دیکھ! تیرے بارے میں دو باتیں مجھے معلوم ہیں، میں اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، جھوٹ مت بولنا، اس نے کہا کیا؟ کہا کہ ایک بات یہ ہے کہ تو سو آدمیوں سے زنا کرے گی، اس کی کیا حقیقت ہے؟ تو اس عورت نے اعتراف کیا کہ ہاں یہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے، اب اسے اور زیادہ یقین ہو گیا کہ جو میں نے سنا تھا، وہ بالکل سچ ہے، خیر اس نے اسے محبت کی وجہ سے درگذر کیا، اس کے ساتھ اچھے طور ہی سے رہنے لگا اور چوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس لڑکی کی موت ایک مکڑی سے ہوگی، تو اس

نے اس کی خاطر ایک شیش محل تیار کیا اور اس میں یہ انتظام کیا کہ کوئی مکڑی وہاں جالہ نہ تانے ؛ مگر عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے ایک دن دیکھا کہ محل میں مکڑی آ گئی ہے ، جب کہ یہ دونوں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے باتیں کر رہے ہیں ؛ لہٰذا وہ گھبرا گیا اور اٹھ کر اسے باہر کرنا چاہا ، تو وہ لڑکی خود اُٹھی اور اس نے کہا کہ میں اسے باہر کرتی ہوں اور اس نے اسے مارنا چاہا ، تو اس عورت کا پیر اس مکڑی پر پڑا ، جس کی وجہ سے اس کا زہر اس کے اندر چلا گیا اور اسی سے اس کی موت واقع ہو گئی ۔

(تفسیر ابن کثیر:۲/۳۶۱)

الغرض موت سے کسی کو مفر نہیں ، بہ ہر حال بھائیو! اس سے یہ بتانا تھا کہ انسان کہیں بھی ہو ، موت آ پکڑے گی ؛ اس لیے موت کا دھیان ہو ، موت کی فکر ہو ، موت کے بارے میں غور و فکر جاری رہے ، کبھی اپنے او پر موت طاری کر کے سوچے یعنی اپنے دماغ میں اور اپنے تصور میں کہ گویا میں مر رہا ہوں ، مجھے نہلایا جا رہا ہے اور مجھے اٹھایا جا رہا ہے ، مجھے لے جایا جا رہا ہے مجھے دفنایا جا رہا ہے ، جو آدمی یہ بات سوچے گا کیا اس کے اندر نرمی نہیں آئے گی ؟ ضرور آئے گی ۔

ایک عورت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئی اور آ کر اس نے دل کی سختی کا علاج پوچھا ، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

" أَكْثِرِيْ ذِكْرَ الْمَوْتِ ، يَرِقَّ قَلْبُكِ "

(موت کو کثرت سے یاد کرنا کہ اس سے تیرا دل نرم ہو جائے گا ۔)

جب اس نے یہ کیا ، تو اس کا دل نرم ہو گیا ۔

(تذكرة للقرطبي:۱/۱۲،العاقبة في ذكر الموت:۴۰، إحياء العلوم :۴/۴۵۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کو یاد کرنا ، یہ بھی دل کو نرم کرنے میں بہت ہی مفید ہوتا ہے ۔

دلوں کو نرم کرنے کا چوتھا نسخہ — قبروں کی زیارت

چوتھی بات، جس سے دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے، جو دراصل تیسری بات کا جز ہے، وہ ہے قبروں کی زیارت کرنا اور، کبھی کبھی قبرستان جانا۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے فرمایا:

«كُنْتُ نَهَيْتُكُم عنْ زِيَارَةِ القُبُورِ،فَزُورُوْهَا ؛ فإنَّهَا تُذَكِّرُ الآخِرَةَ.» (مسلم:۲۳۰۵)

(میں نے تمھیں قبرستان جانے سے منع کر دیا تھا؛ لیکن اب حکم دیتا ہوں کہ قبروں کی زیارت کرو؛ اس لیے کہ وہ آخرت کو یاد دلاتی ہے۔)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ما رأيتُ مَنظراً قَطُّ اِلَّا و القبرُ أفظعُ منه.» (مسند أحمد:۴۵۳)

(میں نے کوئی منظر قبر سے زیادہ بھیانک نہیں دیکھا۔)

کیسا بھیانک منظر ہے؟! دیکھو! مٹی میں لے جا کر اپنے ماں باپ کو دفن کر دیتے ہیں، وہ ماں باپ کہ جب وہ زندہ تھے، تو اگر نیچے زمین پر بیٹھ جاتے، تو آپ کو گوارہ ہوتا؟ کسی میلی جگہ بیٹھ جاتے، تو آپ کو گوارہ ہوتا؟ نہیں اور آپ کہتے ابا جی! امی جی! اوپر بیٹھیے، صوفے پر بیٹھیے؛ لیکن جب قبر میں اتارتے ہیں، تو مٹی میں کیسے لے جا کر سلا دیتے ہیں؟ کتنا بھیانک منظر ہے؟!

اس لیے قبر کو سوچنا دل کو نرم کرتا ہے اور اس کے ساتھ آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے، قبر کو بنانے کی فکر پیدا ہوتی ہے، قبر کو بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اعمال کرو کہ وہاں جانے کے بعد اس قبر کا نقشہ ہی کچھ اور ہو، تا حدِ نظر وسیع ہو، اس کے اندر لائٹنگ ہو، اس کے اندر نرم نرم بستر ہو، اس کے اندر آرام دہ چیزیں ہوں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب قبر میں آدمی سے سوال وجواب ہوگا اور وہ ساری باتوں کا جواب دے دے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کو حکم ہوگا:

«صَدَقَ عَبْدِيْ ، فَافْرِشُوْا لَهُ مِنَ الْجَنَّةِ ، وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ ، وَ افْتَحُوْا لَهُ بَاباً إِلٰى الْجَنَّةِ.»

(أبو داود:۴۷۵۳،مسند أحمد:۱۸۵۳۴)

(میرے بندے نے سچ کہا؛ لہٰذا میرے بندے کو جنت کا لباس لا کر پہناؤ اور جنت کا بچھونا بچھاؤ اور جنت کی جانب ایک کھڑکی کھول دو۔)

فرشتے اسے جنت کا لباس پہنائیں گے اور اس کے لیے جنت کا بچھونا بچھائیں گے اور اس سے کہیں گے: ''نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ'' (دلہن کی طرح سو جاؤ) وہ کہے گا کہ سونے کی بات کیا کرتے ہو؟ ذرا اجازت دو کہ گھر والوں کو بتا کر تو آؤں کہ کیسی کیسی نعمتیں یہاں مجھے ملی ہیں۔

دیکھیے کہ اسے اس وقت خواہش ہوگی کہ بیوی روتی ہوگی، بچے روتے ہوں گے، رشتہ دار پریشان ہوں گے؛ اس لیے میں جا کر ان کو یہاں کی نعمتوں کے بارے میں بتاؤں؛ لیکن اللہ کے فرشتے کہیں گے کہ نہیں نہیں، تم سو جاؤ، تم کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں اٹھائے گا، قیامت کے دن جب وہ اٹھائے گا؛ تب اٹھ جانا۔

ہمارے قلوب کی سختی کا حال

بھائیو اور دوستو! ہمارے دلوں کی سختی کا عالم یہ ہو گیا کہ قبرستانوں میں جا کر لوگوں کو اپنی قبر یاد نہیں آتی، آخرت یاد نہیں آتی، عجیب حال ہے کہ مردے کو دفن کر رہے ہیں اور بازو کھڑے ہو کر ہنس رہے ہیں، مردے کو قبر میں اتارا جا رہا ہے اور یہاں فون سے دنیا کی بات چیت جاری ہے، ایک بندہ اپنی آخرت کے لیے ایک اور

منزل کو پہنچ گیا اور یہ بندہ یہاں کھڑے ہوکر اپنی دنیا کا حساب وکتاب لگا رہا ہے، دلوں کی سختی کا عالم دیکھو کیا ہے؟ ایسے لوگ وہ ہوتے ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا اور فرمایا ہے:

﴿ أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ☆ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾ (التکاثر :۱-۲)

(دنیا کے مال وزر کی فراوانی نے یا تمھارے فخر نے تم کو غفلت میں ڈال دیا، یہاں تک کہ تم اسی غفلت اور اسی لاپرواہی کے ساتھ قبرستان بھی پہنچ گئے۔)

علمانے اس کے دو مطلب بتائے ہیں:

(۱) ایک تفسیر ﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ کی یہ ہے کہ یہاں تک کہ تم نے قبرستانوں کی زیارت کر لی، تب بھی غفلت دور نہیں ہوئی، دلوں کی سختی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہاں جانے کے بعد بھی تمھارے قلب کی سختی دور نہیں ہوئی۔

(۲) اور بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ''یہاں تک کہ تم قبروں میں چلے گئے''، یعنی تم پر موت بھی طاری ہوگئی؛ مگر اس کے باوجود تم تفاخر میں مبتلا ہو۔

دونوں مطلب ہو سکتے ہیں؛ کیوں کہ جس کا دل سخت ہوتا ہے، وہ قبر کے پاس جا کر بھی شقی بن جاتا ہے؛ اسی لیے جتنے مجاور ہیں، وہ سب سے زیادہ سخت دل ہیں؛ حالاں کہ بیٹھے ہیں اولیاء اللہ کے مزاروں پر، بیٹھے ہیں قبر کے قریب؛ لیکن ان سے زیادہ سخت دل کوئی نہیں، قبر کے پاس بیٹھے ہیں؛ مگر اپنی قبر کو بھولے ہوئے ہیں، قبر کے پاس بیٹھے ہیں، اپنی آخرت کو بھولے ہوئے ہیں، قبر کے پاس بیٹھے ہیں، امت کو دھوکہ دے رہے ہیں، قبر کے پاس بیٹھے ہیں، لوگوں کو لوٹ رہے ہیں، لوگوں کا پیسہ بٹور رہے ہیں، گانجا مار رہے ہیں۔ بتاؤ کہ ان سے زیادہ بد بخت اور ان سے

زیادہ شقی القلب اوران سے زیادہ قسی القلب بھی کوئی ہوسکتا ہے؟ کہ قبر کے پاس بیٹھ کر بھی اپنی قبر یاد نہ آئے اور اپنی موت یاد نہ آئے، دل میں اس کا ذرہ برابر تصور بھی نہ ہو؟ اس لیے میں نے کہا کہ یہ سب سے زیادہ سخت دل ہیں۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رَحِمَہُ اللہُ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کے خلیفہ تھے، اُنھوں نے اپنے اشعار میں کہا:

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بُو نے
کبھی غور سے بھی یہ دیکھا ہے تُو نے
جو معمور تھے، وہ محل اب ہیں سونے
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے
ملے خاک میں اہل شاں کیسے کیسے!
مکیں ہو گئے لامکاں کیسے کیسے!
ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے!
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

دو قبر والوں کا ایک عجیب قصہ

یہاں ایک قصہ یاد آ گیا، جو بڑا عجیب ہے، وہ یہ کہ ایک شخص قبرستان گیا، تو وہاں ایک قبر پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا، جس پر لکھا تھا:

”میں اس شخص کا بیٹا ہوں کہ ہوائیں بھی اس کے قبضے میں تھیں، جب چاہتا، ہوا کو محبوس وقید کرلیتا اور جب چاہتا، اس کو چھوڑ دیتا۔“

اس کو پڑھ کر وہ شخص سوچنے لگا کہ یہ کیسے صاحبِ کرامت انسان کا بیٹا ہوگا، جس کے قبضے میں ہوائیں تھیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا انسان تھا، یہی سوچتے سوچتے دوسری قبروں پر نظر دوڑانے لگا، تو دیکھا کہ اس قبر کے بالمقابل ایک اور قبر ہے، اس پر یہ لکھا ہے:

”سامنے کی قبر والے کی بات سے کہیں دھوکہ نہ کھاؤ، یہ کوئی بڑا انسان نہیں تھا؛ بل کہ اس کا باپ تو محض ایک لوہار تھا، جس اپنی بھٹی کو بھڑکانے دھونکنی میں ہوا پکڑ تھا اور اس میں تصفر کرتا تھا۔“

وہ شخص اس کو پڑھ کر ہنسنے لگا کہ یہ قبر والے بھی کیسے عجیب ہیں کہ قبر میں چلے گئے؛ مگر ایک اپنی بڑائی جتا رہا ہے اور دوسرا اس کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔

الغرض بعض لوگوں کو قبر میں جا کر بھی کوئی عبرت نہیں ہوتی، وہ قبرستان جا کر وہاں بھی دنیا ہی کی جانب متوجہ رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحیی رحمہ اللہ کا ایک شعر

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کا عجیب وغریب شعر ہے اور بڑا عبرت انگیز ہے، وہ کہتے ہیں:

قدم سوئے مرقد، نظر سوئے دنیا کدھر جا رہا ہے، کہاں دیکھتا ہے؟

یعنی کہتے ہیں کہ تیرا تو ہر ہر قدم مرقد وموت کی جانب جا رہا ہے؛ کیوں کہ انسان کا ہر قدم، دراصل اسے موت کی جانب لے جا رہا ہے؛ لہٰذا تیرا ہر قدم سوئے مرقد ہے؛ مگر نظر سوئے دنیا، کہ ہر وقت اسی دنیا کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ پھر کہتے ہیں

کہ غور کرکہ کدھر جارہا ہے اور کہاں دیکھ رہا ہے، جا تو رہا ہے قبر کی جانب اور دیکھ رہا ہے پیچھے مڑمڑ کر دنیا کی جانب، یہ ہے حال آج ہمارا!

قبرستان کو قبرستان رہنے دو

اس سختی وقساوت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ آج قبرستانوں کو قبرستان نہیں رکھ رہے ہیں؛ بل کہ قبروں کو گلستان بنارہے ہیں، بلڈنگ بنارہے ہیں، گنبد بنارہے ہیں، بعض قبروں کو دیکھا کہ اس کو ماربل سے بنایا گیا ہے اور اس پر ایک ایک یا دو دو لاکھ کا خرچ ہوا ہے، بعض پر پانچ لاکھ خرچ ہوا ہے اور اس میں مقابلے بھی ہو رہا ہے، یہی ہے تفاخر! جس کا ذکر آیت میں ہے؛ حالاں کہ قبرستان کے لیے حکم یہ ہے کہ قبرستان کو قبرستان ہی رہنے دو، ہاں! ذرا سا بس نشان کے طور پر کوہان کی شکل بنادیا جس کو "مسنم" کہتے ہیں، یعنی اونٹ کے کوہان کی طرح بنادیا جائے، بس اتنی بات کی اجازت ہے، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔

بعض علما نے فرمایا کہ جو لوگ قبروں پر عمارتیں بنادیتے ہیں، قیامت کے دن ان مردوں کو اٹھنے میں بڑی تکلیف ہوگی، پہلے ان کو وہ ساری عمارت نکالنی پڑے گی، پھر باہر آنا ہوگا۔ ارے! ان کو کیوں اتنی مصیبت میں ڈال رہے ہو؟ آرام سے اٹھ جائیں، آرام سے اٹھ کر اللہ کے دربار میں جائیں، ایسی راہ ان کے لیے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک شبہ کا جواب

کسی کو یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب قبروں کو مضبوط کرنا، اس پر تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، تو اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی قبر کو کیوں مضبوط بنایا گیا ہے اور کیوں

اس پر گنبد تعمیر کیا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حکم نہیں تھا، صحابہ کا حکم نہیں تھا، علما و مفتیانِ کرام کا فتویٰ نہیں تھا، اکابرین اس سے راضی نہیں تھے، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تو اپنی تعلیمات میں اس سے منع کیا ہے؛ مگر بعد کے کچھ جاہل بادشاہوں نے بنا دیا تھا؛ اسی لیے حضراتِ صحابہ کی کتنی مزاریں بنیں، کیا کوئی مزار ایسی بنائی گئی؟ بنانے کے بعد جب علما سے اس کا فتویٰ طلب کیا کہ بنانے والوں نے اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی قبرِ اطہر پر یہ سب کچھ بنا دیا ہے، کیا اب اس کو باقی رکھیں یا توڑ دیں؟ علما نے کہا کہ بنانا جائز نہیں تھا؛ لیکن بنانے والوں نے جب غلطی سے بنا ہی دیا، تو اب توڑنا بھی جائز نہیں، کیوں؟ اس سے روضۂ شریف کی بے ادبی ہوگی، گستاخی ہوگی، وہاں توڑ پھوڑ ہوگی، جو اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اذیت و تکلیف پہنچانے والی بات ہے؛ اس لیے یہ بھی نہ کرو، جیسا ہے ویسے ہی چھوڑ دو؛ اس لیے اب وہ اسی حالت پر باقی ہے۔

بہ ہر حال بتانا یہ ہے کہ قبروں کو اس طرح رکھنا چاہیے، جیسے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اس کو سادے سیدھے طریقے پر چھوڑو؛ تاکہ وہاں جانے والوں کو عبرت ہو اور اپنی موت یاد آئے، اپنی قبر یاد آئے، جب اس طریقے پر جانا اور آنا اور اس کی زیارت کرنا ہوگا، تو ان شاء اللہ دل کے اندر نرمی پیدا ہوگی۔

دلوں کو نرم کرنے کا پانچواں نسخہ — اہلِ بکا کی صحبت

آخری بات، جس سے دل کے اندر نرمی پیدا ہوتی ہے، وہ ہے اہلِ بکا میں بیٹھنا، یعنی رونے والوں کے ساتھ بیٹھنا، جو اللہ کی یاد میں، آخرت کی فکر میں اور اپنے احوال پر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہوں، روتے ہوں اور راتوں میں اٹھ کر

اپنے خالق کو پکارا کرتے ہوں، ایسے لوگوں کی صحبتوں اور ان کی مجلسوں میں بیٹھنا بھی ایک بہت بڑا اثر رکھتا ہے اور جیسے کہ ہم جانتے ہیں، ہنسنے والوں کی مجلس میں بیٹھو، تو ہنسی آتی ہے اور رونے والوں کی مجلس میں بیٹھو؛ تو رونا آتا ہے۔ اسی طرح رونے والوں کی صحبت سے بھی دل کے اندر نرمی پیدا ہوتی ہے؛ اسی لیے بہت سی احادیث میں اور علما کے بیانات میں یہ بات ملتی ہے کہ ''مجالستِ علما'' ضروری ہے، ''علما'' سے مراد وہی علما ہیں، جن کے اندر خوف، خشیت اور تقویٰ ہو، ایسے علما کے پاس بیٹھنے اور اٹھنے سے بھی دلوں کے اندر نرمی پیدا ہوتی ہے۔

یہ چند باتیں دلوں کی سختی دور کرنے اور نرمی پیدا کرنے کے سلسلے میں آپ کے سامنے لائی گئیں: پہلی بات قرآن کی تلاوت، دوسری بات ذکراللہ، تیسری بات موت کی یاد، چوتھی بات قبروں کی زیارت اور پانچویں بات علما یعنی اہلِ بکا کی صحبت؛ ان پانچ باتوں کا اہتمام کریں گے، تو ان شاء اللہ دلوں کے اندر نرمی پیدا ہوتی جائے گی، ان چیزوں کا مسلسل اہتمام باقی رکھنے سے ان شاء اللہ ایک دن، پتھر اور پہاڑ دل بھی نرم ہو کر پانی پانی ہو سکتا ہے۔

تعمیر قلب کی آخری منزل

جب آپ ایک طرف دل پر ہونے والے شہوات کے حملوں سے اپنے دل کو بچا کر سختی دور کرلیں اور دوسری طرف دل میں نرمی پیدا کرنے کے نسخے استعمال کر کے دلوں میں نرمی پیدا کرلیں؛ تو اب آپ کو دل کے تعمیر کی آخری منزل طے کرنا ہے، وہ یہ کہ اس عالی شان محل اور پاکیزہ مکان میں عظیم الشان مکین کو لا کر بسانا ہے، جس طرح آپ نے کسی جگہ کو مکان بنانے کے لیے منتخب کرلیا اور وہاں دیکھا کہ جھاڑ جھنکار ہیں، گڑھے ہیں، کانٹے ہیں، تو سب سے پہلے آپ اس کی صفائی کرتے ہیں،

وہاں جو جھاڑ جھنکار ہیں ان کو نکالتے ہیں، گڑھوں کو بند کرتے ہیں، کانٹوں کو نکالتے ہیں۔ غرض یہ کہ وہاں ہر وہ چیز، جو تعمیر میں رکاوٹ پیدا کرنے والی موجود ہو، سب سے پہلے اس کو صاف کرتے ہیں۔ پھر مختلف تعمیری اشیا کو لا لا کر جوڑتے ہیں، اس طرح گھر کی تعمیر مکمل ہوتی ہے۔ پھر اس مکان میں مکینوں کو لا کر بساتے ہیں۔ اگر مکان تو عالی شان بن جائے؛ مگر اس میں رہنے والا کوئی نہ ہو، تو وہ مکان نہیں؛ بل کہ کھنڈر کہلاتا ہے، تعمیر کی محنت بے سود ہو جائے گی، اسی طرح دل کا مکان تعمیر ہو جائے، سج جائے، آراستہ ہو جائے، مزین ہو جائے؛ مگر اس میں کوئی رہنے والا نہ ہو، تو پھر تعمیر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

بھائیو! دل کے جس مکان کی تعمیر کے لیے آپ نے اتنے مجاہدے کیے، خواہشات کو کچلا، گناہوں سے اپنے آپ کو بچایا، شہوات سے پرہیز کیا، لذات سے اجتناب کیا، معصیت سے دوری اختیار کی، نگاہوں پر کنٹرول کیا، زبان کو قابو میں رکھا، کانوں کی حفاظت کی؛ الغرض ہر گندگی و آلودگی کو اور نجاست و غلاظت کو کھرچ کھرچ کر نکال پھینکا، اس کے بعد ذکر اللہ سے، قرآن کی تلاوت سے، عبادت و نیکیوں سے دل کے گھر میں بیل بوٹے لگائے، راتوں میں خوف الٰہی کے آنسوں بہا بہا کر دل کو سیراب کیا، راتوں کی نیند حرام کی، دن کا چین ختم کیا، اتنا سب کچھ اس دل کے مکین کو بسانے ہی کے لیے تو کیا اور کیا مقصد تھا؟

دل کے گھر کا مکین کون ہے؟

اب سوچیے کہ وہ کون ہے؟ جو اس قلب میں بسنے والا ہے؟ اس دل کے گھر میں بسانے کے قابل تو خدا ہی کی ہستی ہے، یہ گھر اسی کے لیے سجایا ہے، یہ گھر اسی کے لیے بسانا ہے، یہ تعمیر اسی کے لیے کی گئی ہے، کہ یہاں پر اللہ تعالی کو بسانا ہے۔

اس سلسلے میں بعض لوگوں نے ایک حدیثِ قدسی ذکر کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

" مَا وَسِعَنِي سَمَائِي وَ لاَ أَرْضِي ؛ وَلكِنْ وَسِعَنِي قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ."

(میں زمین میں نہیں سما سکتا، آسمانوں میں نہیں سما سکتا؛ اگر میں کہیں سما سکتا ہوں، تو میں مؤمن کے دل میں سما سکتا ہوں۔)

لیکن یہ حدیث محدثین کے اصول کے مطابق صحیح نہیں ہے؛ بل کہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے اور اس کی کوئی سند بھی ثابت نہیں ہے۔

(اللآلي المصنوعة:١/١٣٥،المصنوع:١٦٤،المقاصد الحسنة:١/٥٨٩)

ہاں! علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے ایک اور حدیث اس معنی کی "طبرانی" کے حوالے سے بیان کی ہے، اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ لِلّٰهِ آنِيَةً مِنْ أَهْلِ الأَرْضِ ، وَ آنِيَةُ رَبِّكُمْ قُلُوْبُ عِبَادِهِ الصَّالِحِيْنَ، وَ أَحَبُّها إِلَيْهِ أَلْيَنُهَا و أَرقُّهَا. »

(المقاصد الحسنة:١/٥٩٠)

(بلاشبہ اہلِ زمین میں سے کچھ اللہ کے برتن ہیں اور تمھارے رب کے برتن نیک وصالح بندوں کے قلوب ہیں اور ان میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہ ہیں، جو ان میں سے زیادہ نرمی ورقت والے ہیں۔)

یہ ہے مؤمن کا دل! جس کو یوں سجانا ہے، اس کو یوں بنانا وسنوارنا ہے، جب یہ یوں سج ودھج جائے گا: تو اب آپ یوں کہیے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہوگئی

یہ تیرے لیے میں نے سجا دیا ہے، میں نے اس کے اندر سب چیزیں صحیح صحیح لاکر رکھ دی ہیں اور خاص تناسب کی رعایت کے ساتھ، سب چیزیں اس کے اندر بسا دی ہیں، اب یہ گھر کسی کے لیے نہیں ہے، اس میں نہ میرا باپ رہے گا، نہ میری ماں رہے گی اور نہ ہی میرے بچے رہیں گے، نہ میری بیوی رہے گی، نہ میری دولت رہے گی، نہ میرا دوست رہے گا، نہ میرا خاندان رہے گا، نہ دنیا رہے گی، نہ دنیا کا ساز وسامان رہے گا؛ غرض دنیا کی اس میں کوئی چیز نہیں رہے گی، اس میں اگر کوئی رہے گا، تو اے میرے مالک! صرف تو رہے گا۔

حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ کے خلیفہ: خواجہ عزیز الحسن رحمہ اللہ نے اس شعر کو موزوں کیا تھا، جب یہ شعر موزوں ہوا؛ تو وہ اپنے شیخ کے پاس آئے اور ان کو یہ شعر سنایا، تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ پر یہ شعر سن کر وجد طاری ہو گیا اور فرمایا کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپئے بھی ہوتے؛ تو وہ تمھیں دے دیتا۔ واقعی یہ شعر ایسا ہی ہے۔

لیکن ایک بات یہاں سمجھ لیں؛ تاکہ کوئی غلط فہمی بھی نہ ہو اور نہ کوئی بدعقیدگی کا دروازہ کھلے، وہ یہ کہ اس حدیث میں یا اس شعر میں اللہ کے برتن یا گھر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں (نعوذ باللہ) اللہ قیام کرتے ہیں؛ بل کہ یہ معنی ہے کہ اس میں اللہ کی محبت وخشیت سماتے ہیں، اللہ پر ایمان ویقین اس میں داخل ہوتے ہیں۔

دل بنانے کے لیے بھی انجینئر چاہیے

تعمیرِ قلب کے سلسلے میں آخر میں دو قیمتی مشورے دینا چاہوں گا، جو بہت ضروری ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ گھر بنانے والا خود ہی گھر نہیں بنایا کرتا؛ بل کہ کسی

انجینئر (Engineer) سے مشورہ کرتا ہے، اگر کوئی انجینئر سے مشورہ کیے بغیر گھر بناتا ہے، تو گھر تو بن جائے گا؛ لیکن وہ اچھا نہیں بنے گا، اصولِ تعمیر کے مطابق نہ ہوگا، اس میں خامیاں ہوں گی۔

بھائیو! اسی طریقے پر اپنے کے دل کی تعمیر کا آغاز کار کرنا چاہیں؛ تو کسی انجینئر سے مشورہ کر لیجیے، مشورہ کی خاص برکت ہوتی ہے اور مشورہ ان سے کیجیے۔ جو اس کے فن کار ہوں اور دل کے فن کار اہل اللہ ہیں، اہلِ دل ہیں، وہ آپ کو مشورہ دے سکتے ہیں کہ تعمیرِ قلب کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں اور اس میں کیا چیزیں نقصان دہ ہیں؟ جب آپ لوگ عبادات میں، ریاضات میں، مجاہدات میں، اذکار و وظائف میں چلیں، تو آپ کو کس طریقے پر چلنا چاہیے؟

کچھ چیزیں تو شریعت نے عام رکھی ہیں، اس کے لیے مشورہ کی ضرورت نہیں پڑتی؛ لیکن کچھ چیزوں میں مشورہ کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے نماز پڑھنے کا نمبر آئے، تو بغیر مشورے کے نماز پڑھنا چاہیے؛ اس لیے کہ نماز تو فرض ہے اور اس کی تعداد مقرر ہے، مقدار مقرر ہے، ترتیب و طریقہ مقرر ہے، یہاں کسی رائے و مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں؛ لیکن نوافل پڑھنا ہو، تو شیخ سے مشورہ کرے؛ اذکار کرنا ہو، تو مشورہ کرے، اسی طریقے پر خاص خاص وظائف اور مختلف قسم کی عبادتوں میں سے جو نوافل ہیں، ان میں مشورہ کرے کہ کس قدر اور کس طرح یہ وظائف ادا کروں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ نوافل و اذکار کا نہ وقت مقرر ہے، نہ تعداد؛ ممکن ہے کہ ایک شخص نوافل اپنے شوق سے اس قدر کرنے لگا کہ اس کو سہار نہ سکا، اسی طرح ذکر اتنا کرنے لگا کہ برداشت نہ کر سکا، اور چند دنوں کر کے تھک گیا اور پھر سب کچھ چھوڑ دیا، یا چھوڑا تو نہیں؛ مگر برداشت نہ ہونے سے طبیعت خراب ہوگئی یا دماغ پر اثر ہو گیا۔

اگر شیخ سے مشورہ کرے گا؛ تو شیخ اس میں اس کو اس کی حیثیت وقوت دیکھ کر رائے دے گا۔

احادیثِ رسول سے ثبوت

اس بارے میں ہمیں احادیث سے بھی رہ نمائی ملتی ہے، دیکھیے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوئے اور پوچھا کہ کون عورت ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ یہ فلاں عورت ہے، وہ اپنی نماز (کی کثرت) کا تذکرہ کر رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو رہنے دو، تم پر اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ تم طاقت رکھتے ہو، پس اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں اکتاتے، جب تک کہ تم ہی اکتا نہ جاؤ۔

(البخاري:٤٣،مسلم:١٨٧٠،رياض الصالحين:١١٥)

اسی طرح ایک صحابی: حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار وہ باہر نکلے، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آتا ہوا دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ آپ اپنی ضرورت کے لیے جا رہے ہیں، اعراض کیا؛ مگر خود آپ نے ان کو بلایا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے، وہاں ایک شخص کو دیکھا، جو نماز پڑھ رہا تھا اور کثرت سے رکوع و سجدہ کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے:

«عَلَيْكُمْ هَدْياً قَصْداً ، فَإِنَّهُ مَنْ يُّشَادَّ هٰذَا الدِّيْنَ يغلب .»

(مسند أحمد:١٩٨٠١،صحيح ابن خزيمة:١١٧٩،سنن البيهقي:٤٩٣٠)

(تم پر لازم ہے کہ درمیانی طریقہ اختیار کرو؛ کیوں کہ جو بھی دین میں تشدد و غلو کرتا ہے، اس پر دین ہی غالب آتا ہے۔) یہ تین مرتبہ فرمایا۔

اسی طرح ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ ایک لمبی سی رسی دوستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی ہے، آپ نے معلوم کیا کہ یہ رسی کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی رسی ہے، جب وہ عبادت کرتے ہوئے تھک جاتی ہیں، تو اس سے لٹک جاتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو کھول دو، تم میں سے کوئی نماز پڑھے، تو اپنی نشاط وسہولت کے مطابق پڑھے؛ جب تھک جائے، تو سو جائے۔

(البخاري:۱۱۵۰،سنن البيهقي:۴۹۲۷، المعجم الأوسط:۸۸۹۰)

ایک اور حدیث سنیے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا نَعِسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ ، فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لاَ يَدْرِيْ لَعَلَّهُ يَذْهَبُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبّ نَفْسَهُ. »

(البخاري:۲۱۲، مسلم:۱۸۷۱، موطأ مالک:۲۵۷، أبو داود:۱۳۱۲، ابن ماجه: ۱۳۷۰، مسند أحمد:۲۴۳۳۲،صحيح ابن خزيمة:۹۰۷،سنن البيهقي:۴۹۱۵)

(جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آجائے، تو اس کو سو جانا چاہیے؛ یہاں تک کہ اس کی نیند جاتی رہے؛ کیوں کہ جب کوئی نیند کی حالت میں نماز پڑھے گا؛ تو کیا خبر کہ وہ شاید استغفار کرنا چاہے اور خود کو گالی دینے لگے۔)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، تو لوگوں نے کہا کہ یہ ابو اسرائیل رضی اللہ عنہ ہیں، انھوں

نے نذر مانی تھی کہ وہ دھوپ میں کھڑے رہیں گے، نہیں بیٹھیں گے، کسی چیز کا سایہ نہیں لیں گے اور کسی سے بات نہیں کریں گے اور روزہ رکھیں گے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ان کو حکم دو کہ وہ بات چیت کریں، سایہ حاصل کریں اور بیٹھیں اور روزے کی نذر پوری کریں۔

(البخاري:٦٧٠٤،أبو داود:٣٣٠٢،ابن ماجه:٢١٣٦)

اور لیجیے! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایک بوڑھے شخص پر سے گذرے، جو اپنے دو بیٹوں کے سہارے چل رہا تھا، آپ نے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ بتایا گیا کہ اس نے کعبۃ اللہ تک چل کر جانے کی نذر مانی ہے، آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ عَنْ تَعْذِيبِ هٰذَا نَفْسَهُ لَغَنِيٌّ.»

(البخاري:١٨٦٥،مسلم:٤٣٣٦،أبو داود:٣٣٠٣،الترمذي:١٥٣٧، النسائي: ٣٨٥٢،مسند أحمد:١٢٠٥٧،صحيح ابن خزيمة:٣٠٤٤)

(اللہ اس (بوڑھے) کے خود کو اس تکلیف دینے سے مستغنی ہے۔)

پھر آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔

یہ سب احادیث بتا رہی ہیں کہ مجاہدات و ریاضات اپنی مرضی سے کرنے کے بہ جائے مشورہ کر لینا چاہیے؛ تا کہ اپنے مناسبِ حال مجاہدہ ہو۔

بھائی! اگر بغیر مشورے کے آگے بڑھے، تو ذکر تو ہوگا؛ لیکن کبھی ذکر کر کے یہ سمجھ لیا کہ میں تو عرشِ معلیٰ پر پہنچ گیا ہوں، تو اس کی وجہ سے اس کا دل بہت ہی گھٹیا ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ وہ عرشِ معلیٰ پر تو نہیں پہنچتا؛ لیکن عرشِ تعلّی پر پہنچ جاتا ہے اور اس تعلّی و تکبر اور بڑائی کی وجہ سے ساری عبادات و ریاضات بیکار و مردود ہو جاتی ہیں؛ اس لیے شیخ کی رہبری میں ان سب چیزوں کو کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

بلند ہمتی سے کام لینے کی ضرورت ہے

بھائیو! مجھے دوسرا مشورہ یہ عرض کرنا ہے کہ دنیا کے گھر بنانے کے لیے بھی بڑی محنت، بڑے مجاہدے کی ضروت ہے اور ہم خوشی خوشی اس محنت ومجاہدے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اسی طرح دل کی تعمیر کے لیے بھی محنت اور ہمت کی اشد ضرورت ہے، جن لوگوں نے ہمت کی وہ کامیاب ہو گئے، جنھوں نے پست ہمتی سے کام لیا، ان کا گھر کبھی آباد نہیں ہوا۔

ہم میں سے بیش تر لوگ وہ ہوتے ہیں، کہ ان کو دین سے محبت ہوتی ہے، اللہ سے بڑی محبت ہوتی ہے، اللہ سے ان کو تعلق بھی ہوتا ہے، آخرت کی فکر بھی ہوتی ہے، وہ چاہتے بھی ہیں کہ ہم اچھے بن جائیں، وہ چاہتے ہیں کہ گناہ چھوٹ جائے، وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا دل بن جائے، وہ چاہتے ہیں کہ دل میں نرمی آجائے۔ یہ سب کچھ چاہتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود پست ہمتی کی وجہ سے نسخے کو استعمال نہیں کرتے۔ سمجھتے ہیں بڑا کڑوا ہے؛ اس لیے ہمت نہیں ہو رہی ہے، بڑا دل کے اوپر بار ڈالنا پڑے گا اور بار ڈالنے میں پست ہمتی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس کو استعمال کرنے سے دور ہو جاتے ہیں۔ بھائیو! پست ہمتی کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ ایک دفعہ ذرا سی ہمت کر کے چھلانگ لگا دو، ساری پست ہمتی دور ہو جائے گی۔

پست ہمتی کا علاج - افلاطون کا قصہ

ایک قصہ سنا دوں آپ کو پست ہمتی پر؟ قصہ بھی ہے یہ اور لطیفہ بھی: وہ یہ ہے کہ افلاطون کے زمانے میں ایک دفعہ افلاطون ایک کشتی میں سوار کہیں جا رہے تھے، بہت بڑے حکیم تھے، اپنے زمانے کے بہت بڑے عقل مند لوگوں میں ان کا شمار ہوتا

تھا، بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے زمانے کے تھے۔ بہ ہر حال ایک کشتی میں سوار جارہے تھے اور اسی کشتی میں اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے اور ایک بے چارہ پہلی مرتبہ کشتی میں سوار ہوا تھا، سمندر کا سفر تھا، ڈر کر چیخیں مارنا شروع کردیا؛ پست ہمتی کی وجہ سے، زور زور سے رورہا ہے، چیخ رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بھائی! کیا مصیبت آئی؟ کیا پریشانی ہے؟ کہنے لگا کہ کشتی میں ڈر لگتا ہے، افلاطون اپنے غور وفکر میں غرق تھا؛ اس لیے کہ وہ کوئی عام آدمی تو تھا نہیں، وہ ہر وقت غور میں، فکر میں، تلاش میں، جستجو میں، حقائق کے دھیان میں رہتا تھا، تو اپنے آپ میں مگن بیٹھا ہوا تھا، بہت دیر کے بعد اسے احساس ہوا کہ یہاں کچھ ہو رہا ہے، اس نے پوچھا کیا تماشہ ہے؟ کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا کہ دیکھیے! یہ صاحب بہت رورہے ہیں، پریشان ہو رہے ہیں۔ کہا کہ کیوں؟ کہا گیا کہ پہلی دفعہ کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں سفر کررہے ہیں اور ڈر کے مارے چیخ رہے ہیں۔

افلاطون بہت بڑا عقل مند تھا، اس نے کہا کہ اس کا علاج میں کرتا ہوں، اس نے دونوں طرف سے اس آدمی کو ایک دم دبوچا اور اٹھا کر کشتی کے باہر سمندر میں زور سے ڈال کر ایک ڈبکی لگایا اور اٹھا کر بٹھا دیا، اٹھ کر جو بیٹھا، تو وہ آدمی ایک دم خاموش ہوگیا، اب آواز بالکل نہیں۔ لوگوں نے کہا عجیب علاج ہے؟ پوچھا کہ جناب! یہ کیا علاج تھا؟ کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ کشتی کے اس سفر کو بہت بڑا خطرہ سمجھ رہا تھا؛ اس وجہ سے یہ پریشان ہو رہا تھا، میں نے اس کو اس طریقے سے یہ بتا دیا کہ جہاں تو بیٹھا ہے، یہ عافیت ہے، اس سے بڑا خطرہ یہ ہے، ذرا ڈبکی مار کے دیکھ، یہاں کا خطرہ، اب جو اس خطرے میں جا کے آیا، تو اسے معلوم ہوا کہ میں تو بڑی عافیت میں تھا۔ اب یہاں بیٹھ کر شکر کررہا ہے۔

اسی طرح ہمت کر کے اگر ایک چھلانگ آپ لگا دیں، تو پھر اس کے بعد ساری پست ہمتی ختم ہو جاتی ہے، اب دیکھو پہلے تو کیسا پست ہمت ہو رہا تھا، اب دیکھیے کہ پست ہمتی ختم ہو گئی، آرام سے بیٹھا ہوا ہے، خوشی خوشی بیٹھا ہوا ہے۔

اسی طرح یہ نسخے دینِ اسلام کے سلسلے میں اگر ہم کو ذرا کڑوے لگتے ہیں، ہمت نہیں ہوتی؛ تو یہ ہمت اس لیے نہیں ہوتی کہ ہم ہمت کرتے نہیں ہیں، ایک دفعہ کر کے دیکھو، دو دفعہ کر کے دیکھو، پھر اس کے بعد ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ آدمی اس کے بغیر سکون سے نہیں رہتا؛ اس لیے ہمت کرنی چاہیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دلوں کو منور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین